ایڈز

خورشید حیات

(افسانے)

خورشید حیات

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔

چیف کنٹرولر، ساؤتھ ایسٹرن ریلوے

کتاب :ایڈز (افسانے)

اشاعت :۲۰۰۰ء

قیمت :ساٹھ روپے-/RS. 60

تعداد :چھ سو (600)

کمپوزنگ : محمد فاروق اعظمی 'یونک کمپیوٹر سنیٹر' سبزی باغ' پٹنہ۔۴

سرورق :ساریکا

مطبع :کراؤن آفسیٹ 'سبزی باغ' پٹنہ۔۴

ناشر: نغمہ حیات 'برائے مکتبہ الحیات' نیو کریم گنج' گیا۔۸۲۳۰۰۱

تقسیم کار:

بک امپوریم' سبزی باغ' پٹنہ۔۴

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مکتبہ قصر الادب' پوسٹ بکس نمبر 3770' گرگام پوسٹ آفس' بمبئی 400004

شب خون کتاب گھر' پوسٹ باکس نمبر ۱۳۔ الہ آباد۔211 003

خورشید حیات' بنگلہ نمبر۔T/2 /217- بنگلہ یارڈ' بلاسپور۔495 004

الحیات' نیو کریم گنج' گیا۔۸۲۳۰۰۱

کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

❁

اس تخلیق کار کے نام
جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے

❁

ترتیب

افسانے خراد مشین پر

میں کون ہوں ؟
میں کیوں ہوں ؟؟
میں کچھ ہوں ' تبھی تو ہوں
کچھ نہ ہوتا تو بنایا کیوں جاتا
......

......

حیات کے بحر بیکراں میں خورشید حیات کوئی اہم نام نہیں ۔ مگر خورشید کی اپنی اہمیت اور حیات سے دنیا کی رونق کا انکار کسے ہوسکتاہے؟ ویسے جس خورشید کی بات میں کررہاہوں ' وہ ابھی سفر میں ہے کہ سفر زندگی کی علامت ہے۔

جانور ' نہیں بولنے سے تکلیف اٹھاتاہے' اورآدمی بولنے سے ......

تحریریں کیوں بولتی ہیں؟

"لفظ" لمبی زبان نکال کر کیوں شور کرتاہے۔

"لفظ" پنگولن کی شکل کیوں اختیار کرلیتا ہے۔
اپنی زبان سے ' چیونٹیاں اوردیمک کیوں کھاتا ہے ۔
لفظ' لفظ' جملے!

جملے تو بڑے مقدّس ہوتے ہیں
مگر کون ہے ' جو اسے گلے لگائے

......

......؟؟

اظہار' کسی کے بھی "میں" کے ذریعہ ہو۔ اسے کھلی اور آزاد فضا ملنی چاہئے۔

میں =ہم =ہم سب

ہم سب اتنے آگے چلے آئے ہیں کہ پیچھے کی طرف مُڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں رہی اور اگر کوئی پیچھے کی طرف دیکھتا بھی ہے تو اسے سب کچھ دھندلا دھندلادکھائی دیتا ہے۔ ہماری تہذیب، ہمارا کلچر، ہماری زبان، سب کچھ نقطہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔جسے ہم تھکاوٹ کے اُن لمحوں میں دیکھ لیتے ہیں۔ جب ہمیں لگتاہے کہ زندگی کچھ دیر کے لئے ہم سے دور چلی گئی ہے ۔ کیا کہیں ہم زندگی کو ، فرصت نہیں اپنے کارو بار سے ۔ ہم سب زندگی کی کڑوی سچائیوں کو پانی کی طرح پی رہے ہیں ۔ جی رہے ہیں ایک اپاہج کی طرح ۔

پہلے دادا ،دادی ، نانا ، نانی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ زمین تھی،کھیتی تھی، زمینداری تھی، جائداد تھی، بڑے بڑے کمرے تھے ، بڑی بڑی حویلی تھی، آنگن تھے، کنواں تھے ، پھلواری تھی ، مسجدیں تھیں، محبتیں تھیں ، لالٹین کی روشنی تھی،کچّی سڑکیں تھیں، پگڈنڈیاں تھیں ۔

لوگوں کے قدم جس راستے سے گزرتے تھے وہ پگڈنڈیاں بن جاتی تھیں ۔ رسّی کی بنی ہوئی کھاٹ تھی، چوپال تھے، دادی، نانی کے قصّے تھے، داستانیں تھیں، بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ

جنھوں نے اس دور میں زندگی گزاری۔جہاں کوئی چھل کپٹ نہیں تھا، ایمانداری تھی، خلوص تھا ، گاؤں تھا، گاؤں کی ہریالی ، آم کے پیڑ پر کوئل کی کوکو، امرود کے پیڑ پر چڑیوں کا چہچہانا، گلہریوں کا ادھر ادھر دوڑنا، مٹی کی ہانڈی میں دودھ کا ابلنا، مٹی سے بنے برتن میں گوشت کا پکنا۔

اپنے وطن کی مٹّی سے بنی ہانڈی
ہانڈی میں بنی چائے
چائے کی سوندھی ، سوندھی خوشبو
خوشبو ، اپنے وطن کی مٹی کی
الگ الگ تہذیب کی
زبان کی ، خلوص کی ، اپنا پن کی

"مٹی کی ہانڈی" اب ہمارے گھروں سے غائب ہوگئی ہے۔ ہماری پہچان کی طرح !

ختم ہوتی ہوئی روایت کی طرح۔

" مٹی کی ہانڈیاں" اب ٹوٹ چکی ہیں اور جو بچ گئے ہیں وہ "اینٹک پیس" بن کر سجی ہیں ، جو استعمال میں نہیں آتیں۔

"لوہے کے برتنوں" میں کھاتے کھاتے،آج ہمارے دل بھی "لوہے" کے ہوگئے ہیں۔

دادا ، دادی ، نانا ، نانی ، ابّی ، امّی ، اب کوئی نہیں رہے۔ خورشید حیات تم یتیم ہوگئے۔

یہ لکھنا کتنا آسان ہے۔ مگر اس کا احساس کتنا تکلیف دیتا ہے ، بے چین کردیتا ہے ،حسّاس آدمی آنسو بہاتاہے، زندگی پھر معمول پر آجاتی ہے۔

"آنسو بہانا" بزدلی ہے۔ حالات کامقابلہ کرو۔

......

۹ ، مارچ ۱۹۹۸ء
۱۲ جون ۱۹۹۸ء

......

" وقت کس گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے ۔ اس کی رفتار کیسی ہے ۔ تاریخ بدلتی رہتی ہے ۔
لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے ۔ کیا پھر اس تاریخ کا سرکولر موشن ، ہمیں ماضی کی خوشحالیوں/اطمینان اور سکون کی جانب لے جائے گا (وقت کے احاطے میں) ۔
"ہتھیلی" کی پانچ انگلیاں جڑوں کو کریدنے میں کیوں لگی ہیں؟
وہ انگلیاں ،جن کا وجود "ہتھیلی" کے بغیر ادھورا ہے
انگلیاں
چھوٹی بڑی انگلیاں

......

......

بھیڑ چلی جا رہی ہے ، تیز دھوپ میں ، بارش میں اور نتیجہ ؟
ہم اپنی ادبی / تہذیبی / ثقافتی / روایت کو زندہ رکھنے کے لئے کیا کر رہے ہیں ؟
کہانیوں کا مجموعہ / غزلوں کا مجموعہ / تنقیدی تحقیقی مضامین / ڈرامے پڑھنے والا کون ؟؟
خود ، فنکاروں کا " ادبی سماج " جس کا دائرہ بہت چھوٹا ہے ۔
ہماری آبادی کتنی ؟ ہماری زبان کدھر ؟
" ادب بازار " میں کتابوں کی خرید و فروخت نہیں کے برابر ۔
بہت کچھ کہا جا چکا ۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ۔ صورتحال یہ ہے کہ ہر فرد ایک سے زائد چہروں کا مالک ہے ۔ قول و فعل میں بڑا تضاد ہے ۔ جو نام آوری کا خواہاں تو ہے / عوام کے درمیان مقبولیت تو چاہتا ہے ۔ مگر اپنی " زبان " کے لئے خونِ جگر تو دور کی بات ، اپنے پسینہ کی ایک بوند بھی ٹپکانے کو تیّار نہیں ۔ شاید اس لئے کہ یہ وہ اوسر اور بنجر کھیتی ہے ۔ جہاں سے شاید بڑی محنتوں کے بعد بھی کچھ نہ مل پائے ۔ زیادہ توقع نہیں ملنے کی ہے ۔

اکیسویں صدی کے بچے نہیں جاتے مدرسے/ جاتے ہیں کلب ڈانس سیکھنے / میوزک کلاس کرنے / وہ نہیں جانتے اردو ، جانتے ہیں انگریزی اور تھوڑی بہت ہندی بس ۔

اردو کہانی کا قاری کون ؟

خود تخلیق کاروں کا سماج ؟

آج جو بھیانک منظر ہماری آنکھ کی پتلی پر بنتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آج کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں اور آنے والے کل کی سوچ رہے ہیں ۔ جبکہ اپنی تہذیب / ثقافت / پہچان سب کھو بیٹھے ہیں ۔

ہم سب زندہ لاشیں ہیں ۔ ہمارے ہاتھ میں قلم تو ہے ۔ لیکن قلم سے نکلے لفظ معنی کھو چکے ہیں ۔ ہمارا احساس ، ہمارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے ۔

کوئی بھی شخص اپنے دھرم پر نہیں چلتا ۔ لیکن دھرم کے نام پر لڑتا ہے ۔ زبان کے نام پر نفرتیں تقسیم کرتا ہے ۔ مگر اپنی زبان اپنی تہذیب کی حفاظت نہیں کرتا/ سیکھاتا ہے انگریزی / بھیجتا ہے کلب ۔

سیکھاتا ہے میوزک / ڈانس/ کہ شاید یہی ہے ہماری پہچان / کہ شاید اسی لئے ہوئی ہے ہماری تخلیق / کہ شاید اسی لئے بھیجا گیا ہے ہمیں اس دھرتی پر / کہ شاید ......

لہر ، لہر ، سمندر

لہریں زندگی کی علامت

ابھرتی ڈوبتی لہریں میری زندگی میں بھی ہیں اور کہانیوں میں بھی ۔ میری کہانیاں/ میرا "میں" بَل کھاتی لہروں کا ہی ایک حصّہ ہیں ۔

میرا "میں" جو ابھی ساؤتھ ایسٹرن ریلوے میں چیف کنٹرولر ہے ۔ جو کبھی سائنس کا طالب علم ہوا کرتا تھا ۔ اور بعد میں جس نے اردو میں ایم اے کیا ۔ بہار کے ایک شہر رانچی میں جس کے

وجود کا ثمر نو ' جو ترتیب کے حساب سے تیسرا ثمر تھا ، شجر حیات پر ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو نمایاں ہوا۔

۱۹۷۴ء کی ایک رات ، میرے اندر تخلیقی لہر کب اور کیسے داخل ہوگئی' مجھے معلوم نہیں' کہ گھر کے " آنگن میں " دور دور تک کوئی کہانی کار / شاعر نہیں تھا۔ ہاں' والد محترم 'ابو الحیات شیدا(مرحوم) کی ذہنی تربیت نے " سرمایۂ حیات " (ذاتی لائبریری) میں رکھی ادبی / مذہبی کتابوں میں چھپے ہر لفظ سے مجھے روشناس کرایا'اور پھر رانچی سے لکھے ان کے ایک تفصیلی خط نے مجھے کہانی کار بنا دیا ' کہ ہر لفظ کچھ کہہ رہے تھے اور مجھے زندگی کی حقیقت سمجھا رہے تھے دوسری طرف میری صاف ستھری / نکھری زندگی میں میری امّی (مرحومہ) کا بہت بڑا ہاتھ رہا کہ انہوں نے "انگلی " پکڑ کر چلنا سیکھایا۔

۱۹۷۴ء کی وہ رات۔ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے کہ ابّی کے قلم سے نکلے ہر لفظ میری نیند چرا کر لے گئے تھے۔ رات بھر میں کچھ لکھتا رہا' کاٹتا رہا' ردّو قبول کی منزلوں سے گزرتا رہا۔ اور پھر جو کچھ میرے قلم نے مجھ سے لکھوایا اسے ایک لفافہ میں بند کر کے بچوں کے رسالہ "نور" میں بھیج دیا۔ اسی طرح میری پہلی کہانی بچوں کے رسالہ "نور" میں "انوکھی تبدیلی" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ابتداء میں' بچوں کے لئے لکھتا رہا۔ جن میں زیادہ تر کہانیاں ، نور(رام پور ' یوپی)' پیام تعلیم ، " نوخیز" ' آج کل (ضمیمہ) نئی دہلی ، خوشبو (سہسرام) اور کئی دوسرے رسائل میں شائع ہوئیں۔

دھیرے دھیرے جب میرا مطالعہ بڑھا تو یہ احساس ہوا کہ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں۔ وہ روایتی انداز کی چیزیں ہیں۔ مجھے ان سب سے الگ ہٹ کر کچھ لکھنا چاہئے اور تب ہوا یہ کہ جس دن میرے اندر یہ احساس جاگا' اسی دن سے بچوں کے لئے کہانیاں اور مضامین وغیرہ لکھنا چھوڑ دیا ، اور پھر اس طرح کی کہانی لکھنے

لگا ۔ جِسے نئی کہانی / آج کی کہانی کا نام دیا جاتا ہے ۔ اب تک میری کہانیاں شاعر (بمبئی) ، اردو ادب (راولپنڈی ، پاکستان) ، کتاب نما (نئی دہلی)، نیا دور (لکھنئو) ، نئی نسلیں ، لمحے لمحے (افسانہ نمبر) ، قوس (نیا افسانہ ، نئے نام) ، معلّم اردو (گوشۂ خورشید حیات)' اسباق (پونہ) ادب نکھار ، سیپ ، اندیشہ ، نئی نسلیں ، پیش رفت ، افکار ملی ، آہنگ ، سہیل ، زبان و ادب' حالی (نئی کہانی ۔ نیا مزاج) اور کئی دوسرے رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔۔

رابن شا پشپ کی ترتیب دی ہوئی کتاب " بہار کے یووا اردو کھتا کار " اور ڈاکٹر وہاب اشرف کی کتاب " بہار میں اردو افسانہ نگاری " میں بھی کہانی شامل ہے۔ اور بھی بہت کچھ ، کس کس کا ذکر کروں ۔

۲۵ جنوری ۱۹۸۲ء میں گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی کے ہاتھوں انعام سے بھی نوازا گیا یہی تو ہے میری مختصر سی کہانی ۔

۱۹۸۶ء میں ریلوے کی زندگی کا حصّہ بننے کے بعد ، وہ " قلم " جس سے میں کہانیاں لکھتا تھا ، مجھ سے دور ہوتا گیا ۔ کہانی کے کردار چھٹپٹاتے رہے ۔ پھر ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو شادی ہوئی ، نغمہ' میری زندگی میں داخل ہوئیں ۔ پھر یکم مارچ ۱۹۹۲ءکو بُشریٰ آفرین اور ۲۳ جون ۱۹۹۴ءکو عائشہ نور...... وقت کروٹ بدلتا رہا ۔ دونوں بیٹیاں بڑی ہونے لگیں ، پیاری پیاری باتیں کرنے لگیں ' اور پھر ہوا یہ کہ آفس سے آکر جب کبھی کچھ لکھنے بیٹھتا تو یہ دونوں سُر میں سُر ملا کر کہتیں ۔ " شام سے لکھنے بیٹھے ہو ، رات ہوگئی ، اپنی بیٹیوں کی طرف بھی مڑ کر دیکھو...... پھر ، میں ان لوگوں کی طرف ایسا مُڑا کے پیچھے چھوٹتی ہوئی ادبی زندگی کی طرف نہیں دیکھا ۔ دونوں بیٹیاں اسکول میں فرسٹ آتی رہیں ۔ دوسری طرف ریلوے مجھے کئی انعامات اور سند سے نوازتی رہی ۔

نغمہ / بُشریٰ / عائشہ اور ریلوے کی زندگی ۔ ان سب کے بیچ

میرے اندر کا کہانی کار گُم ہوگیا ۔ اس کی پیاس بُجھ گئی ۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ میں جب تخلیقی مراحل میں ہوتا ہوں ، جب قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ تو کہیں نہ کہیں پر میں ن ،ب ، ع، کے ساتھ نا انصافی کرتا ہوں ۔ ڈیوٹی سے آنے کے بعد ، میرے انتظار میں، تھکی ہوئی یہ آنکھیں ،مجھ سے وقت کا کچھ حصّہ مانگتی ہیں ۔

آفس سے آنے کے بعد بچے ہوئے لمحے میں نے ان کے نام کر دیے ۔

گذشتہ دو برسوں میں زندگی میں کچھ ایسی اتھل پتھل مچی کہ میں بہت " پیاسا " ہوگیا ۔ میرا وجود کئی خانوں میں بکھر گیا ۔ ابّی (ابو الحیات شیدآ) اور امّی (آصفہ خاتون) ان دونوں کے ناموں کے آگے مرحوم / مرحومہ جڑ گیا ۔ ہم سب کو روتا بِلکتا چھوڑ کر چلے گئے دُور ، بہت دور ، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ بڑے نیک صفت تھے وہ ۔

" الحیات " کے کمرے سُونے ہوگئے ۔ سُونی ہوگئیں راتیں ۔

میں اتنا بڑا غم برداشت نہیں کر سکا اور ایک خطرناک بیماری نے مجھے دبوچ لیا ۔ بلاسپور سے پٹنہ اور پٹنہ سے دہلی تک علاج کے سلسلے میں بھاگتا رہا ۔ دوسری طرف "مُلّا بَخش" کے فتوے جاری رہے ۔

لیکن ایک طرف جہاں "مُلّا بَخش" کے فتوے جاری تھے وہیں دوسری طرف قدرت /فطرت اپنا کام کررہی تھی۔ "خالق" نے کچھ ایسا کر دکھایا کہ ڈاکٹر بھی حیران اور میں بھی............ کہ میرا 'میں' پھر سے لوٹ آیا ہے ۔ پوری توانائی کے ساتھ ۔

یہی تو ہے میرا "میں" ! جوآپ کے "میں" کے ساتھ مِل کر "ہَم" بننا چاہتا ہے۔

خورشید حیات

ایـــــــــڈز

اور پھر وہ دن بھی آیا......

جب مجھے اپنا گاؤں' اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا تھا۔ جیسے جیسے ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت قریب آرہا تھا۔ میری تو جیسے جان ہی نکلی جارہی تھی۔ کسی طرح سے میں نے دل کو کڑا کیا اور پھر اپنے گاؤں اپنے شہر اور اپنے ملک ایک ایک کو چھوڑتا ہوا اس سرزمین پر جا پہنچا جو برسوں سے آشی کے لئے ہی سہی زندگی کا نصب العین بنی ہوئی تھی۔

لندن کا ہوائی اڈہ دور سے مشینی زندگی کا تعارف پیش کر رہا تھا اور کشتیٔ حیات ٹربولنٹ موشن میں رواں تھی۔ چاروں طرف آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں' بھاگ دوڑ' چمک دمک' مشینی زندگی اور ان سب کے درمیان لوگوں کی مصنوعی ہنسی۔

جہاز سے اترتے ہی مجھے لگا کہ میں نے باہر کا کچھ پایا ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی اندر کا کچھ ایسا اپنا پن کھو دیا ہے جو زندہ رہنے کی پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔ آشی ان باتوں سے بے خبر تھی۔ کئی مرتبہ چھک کر اس نے میرا دھیان بھی موڑنا چاہا۔ لیکن میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اکیلے ہی نئی زندگی کو محسوس کرنے میں گُم ہو گئی۔

ریموٹ کنٹرول

ٹی۔وی

رقص

پرچھائیاں

......

......

ہم سب کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے انلارج ہونے لگیں۔ پھر انلارج ہوتے ہوتے ایک عالیشان عمارت میں گُم ہو گئیں۔ کمپنی کی طرف سے جو فلیٹ ملا تھا۔ نہایت ہی خوبصورت تھا۔ ایک خوبصورت سا گارڈن۔ سوئمنگ پول اور احاطہ سے باہر گاڑیوں کی آمدورفت!

ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر باہر کے مناظر آسانی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ کیونکہ اس کی کھڑکیاں پورب، پچھّم، اتّر اور دکھن کی طرف کھلتی تھیں۔

میں ابھی پچھّم کی طرف کے مناظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک چڑیا سیلنگ فین سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی ہے چڑیا کمرے میں کیسے آئی اور پھر اس کی موت؟

ہم لوگوں کو لندن میں آئے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ دن بھر مشینوں جیسی زندگی۔ ہر جگہ بناوٹی تعلق کوئی بھی ایسا نہیں جس سے دو منٹ بیٹھ کر گفتگو کی جا سکے۔ یہاں تک اپنے علاقہ کے لوگوں کی یہ حالت تھی تو غیروں

سے کیا شکوہ۔ سبھی ایک ہی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اس بندھے ٹکے ماحول میں اکثر میں حسین یادوں میں کھو جاتا۔

بسکومان کی سروس...... شام میں دوستوں کے قہقہوں کے بیچ وقت کیسے گزر جاتا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ لمبی چوڑی بحثیں اب بے معنی لگنے لگی تھیں۔ یہاں تو سب کچھ بندھا بندھا سا تھا' زندگی ایک دائرے میں محدود' ہنسنا بھی دھیرے سے ہوتا۔ جیسے اس پر بھی پابندی ہو۔ ایک وقت وہ تھا۔ جب بابا رات گئے تک ببلو کو کہانیاں سنایا کرتے تھے اور ببلو کی حالت یہ تھی کہ بابا سے کہانی سنے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن یہاں اسے کہانیاں سنانے والا کوئی بابا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی چندریکا مہتو کا لڑکا نہیں تھا۔

حال

مستقبل

ماضی

آشی' ببلو' بابا اور میں

بس یہی تو تھا۔ چھوٹا سا پریوار۔ ایک مڈل کلاس طبقے کی زندگی گزر رہی تھی۔ لیکن آشی کسی بھی طرح مڈل کلاس طبقے کی زندگی گزارنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ بات بات میں بگڑتی' مجھے طعنے دیتی اور زور دیتی کے غیر ممالک چلے چلئے۔ اپنے ملک میں کیا رکھا ہے۔ اس نے بڑے بابو' ماسٹر جی' کرانی بابو' ان تمام لوگوں کی زندگی کا حقیقی رنگ دیکھا تھا۔ کڑی محنت کے باوجود تنخواہ اتنی کم ہوتی کہ زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس نے ان لوگوں کی زندگی کا بھی ایک رُخ دیکھا تھا جن کے مکانوں کی چھت مکمل نہیں ہوتی ہے اور جہاں لوگ خون تھوکتے ہیں۔ آشی پستے ہوئے طبقے کی زندگی گزارنا

نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی خواہشوں کا دم گھٹتا ہوا دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ جب دولت کی فراوانی ہوگی تو سوسائٹی میں مقام بھی بلند ہوگا۔

حال

ماضی

مستقبل

اور تمنائیں

میں نے کئی مرتبہ اس زندگی سے دور بھاگنے کی تمنا کی، مگر میں اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ آشی کی خوشیوں کا خیال رکھنا تھا۔ کیونکہ اس کا رشتہ اس شہر اور ملک سے سگما بونڈ سے جڑا ہوا تھا۔

مجھے اپنے قریب بلالو بابا اور الف لیلیٰ والی داستان اپنے ببلو کو سناؤ کہ وہ سونا بھول گیا ہے۔

میرے پاس تو کہنے کو کچھ بھی نہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک حصہ مشین میں تبدیل ہوگیا ہے۔ جو کسی ریموٹ کنٹرول کے اشارے پر اپنا کام کررہا ہے۔ ابتدا میں وہ اور میں کے درمیان زبردست جنگ ہوتی رہی آخر کار میرے "میں" کی شکست ہوگئی اور "وہ"......؟

"وہ" کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی کہ وہ مجھے جس طرح چاہ رہا تھا استعمال کررہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں سب اس کے اشارے پر اپنا کام کر رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ 'ہاں وہ' مسکرا رہا تھا کیونکہ ادھر بابا کی زمین جو صرف دو بیگھہ تھی، ۲۰ بیگھہ ہوگئی تھی اور کرائے کے مکان کی جگہ سہ منزلہ عمارت نے لے لی تھی۔

وہ میدان جہاں گاؤں کے لڑکے کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ وہاں بڑی بڑی کوٹھیاں اور عمارتیں تیار ہوچکی تھیں۔ پھلگو کی تپتی ریت کی جانب جانے

والی اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی اب پکّی سڑک میں تبدیل ہو چکی تھی یہ سب صرف ایک سال کا کرشمہ تھا۔ گاؤں کے کئی انجینئر' ڈاکٹر بھی دائرے سے باہر نکل چکے تھے روشنی کی تلاش میں...... !"وہ" قہقہہ لگا رہا تھا اور "میں" آکسیجن کی کمی سے دم گھٹ رہا تھا

ٹی۔وی

موسیقی

رقص

پرچھائیاں

ریموٹ کنٹرول

......

......

زندگی تیز رفتار تھی' آرام کی خاطر !

وقت گزر رہا تھا کہ آسانیاں ساری بہم تھیں۔ دوڑ دھوپ' دن بھر کا مشغلہ ۔ پھر شام کی فرصت عیش کی ضرورت کی جانب مائل کر دیتی ۔ تحریکات جسمانی سے مجبور ہو کر آغوش حسن میں پناہ گزیں ہو تا رفتہ رفتہ صنف نازک سے نفرت ہوئی۔ مگر تسکین کا کوئی نیا سامان بھی ایجاد کرنا تھا۔ ہم سے پہلے وہ سامان وہاں مہیا تھے ۔ ایک دو بار استعمال کے بعد جسم نے تسکین پائی دماغ کو لذّت ملی۔ مگر لذّت 'لذّت کے لئے تڑپتی رہی اور اس نے INFINITIVE انفینٹو کے حدود چھو لئے کہ جس منزل پر پہنچ کر صرف سراب ہی سراب تھا۔ سراب میں بھی لذت ہوتی ہے ۔ مگر میں ایڈز AIDS کا شکار ہو چکا تھا۔ اور ہسپتال کے ایک کونے میں پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ جدید دنیا نے مجھے سب کچھ دیا۔ مگر جسم کے اندرون کی طاقت چھین لی۔ جسم

کی فوج آج آخری شکست کھانے والی تھی۔ بیرونی کمک بھی اس کے کام نہیں آرہی تھی بلڈ ٹرانسفیوزن BLOOD TRANSFUSION کا عمل جاری تھا اور میرا ذہن خلاء میں پرواز کر رہا تھا کہ شاید جیتے جی میری یہ تمنا راس نہ آئی تھی۔ قدرت نے اس کا آج پاس رکھا تھا اور میرا ابلو میری بغل میں کھڑا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ آنے والا کل کہیں اس سے انتقام نہ لے۔

وقفہ

......

......

سائرن کی آواز!

مُردہ لے جانے والی ٹرالی وارڈ میں داخل ہو رہی تھی اور ڈاکٹر اپنے چہرہ سے ماسک MASK ہٹاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ یہ کہتا ہوا۔

VERY SORRY ACQUIRED IMMUNE DEFFICIENCY SYNDROME IS FATAL

()()()

طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد

باہر کے سارے دروازے بند تھے' اور اندر ایک ہیجان سا برپا تھا' سکون کی تلاش جاری تھی اور ہر ایک کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ گھبرایا' گھبرایا سا۔ شاید کہ وہ کسی بڑے خطرے کے انتظار میں تھے۔ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی اور سب لوگ سراسیمہ سے ہو کر خاموش ہو گئے۔

دستک ہوتی رہی اور لوگ سنتے رہے۔ کیونکہ وہ ڈرے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ کھولنے پر کہیں کوئی طوفان نہ نازل ہو جائے۔ مگر طوفان کا راستہ کب روکا جا سکتا ہے۔ طوفان کو جب نازل ہونا ہوتا ہے نازل ہو کر رہتا ہے' طوفان کا راستہ بدلا جا سکتا ہے' طوفان کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مگر طوفان کو روک لینا اب تک ممکن نہ ہو سکا۔

دروازہ پر دستک تیز ہوتی جارہی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ سارے لوگ خوف وہراس کے مارے ہوئے اوپر کی منزل پر جانے لگے' اور باہر دستک کی آواز شدید سے شدید تر ہوتی گئی لوگوں کو محسوس ہُواا کہ وہ غلط کررہے ہیں۔ دروازہ کھول ہی دینا چاہیے۔ مگر دروازہ کھلنے پر مدافعت کی کیا صورت ہوگی۔ اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ گھبراہٹ میں غور کرنے کی فرصت بھی کسے تھی۔

اندر کے ایک جیالے نے دروازہ پر آکر پوچھا...... "کون ہے؟"

دستک رک گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کیونکہ دروازہ پر دستک دینے والا اجنبی تھا' اور اجنبی کے پاس شناخت کے لئے کچھ نہ تھا کہ وہ اندر والے کو بتلا سکتا کہ وہ کون ہے۔

خاموشی نے تجسّس' تحیّر اور خوف میں اضافہ کیا مگر اس جیالے کے آگے بڑھنے سے اتنا ہوا تھا کہ اندر کے سارے لوگوں کو کچھ طاقت مل گئی تھی اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آکر دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

ایک نے کہا "دروازہ کھول دو!" دوسرے نے کہا "کمینہ جواب ہی نہیں دیتا۔"

تیسرے نے کہا...... "وہ تنہا لگتا ہے۔ ہم لوگ اتنے ہیں کیا کرے گا؟ کھول دو دروازہ!"

چوتھے نے کہا...... "ذرا غور کرلو کوئی آفت نہ نازل ہو جائے"

پانچویں نے کہا...... "کیا ہم سب مل کر آفت کا مقابلہ نہیں کر

سکتے۔ کھول دو دروازہ۔ کیا کرے گا؟ موت برحق ہے' موت پر ایمان ہے تو وقت پر آئے گی۔"

چھٹے نے کہا۔ "مصلحت بھی کوئی چیز ہے میاں' مصلحت سے کام لو"

ابھی یہ سرگوشیاں ہو ہی رہی تھیں کہ دستک پھر شروع ہو گئی اور اندر والوں میں سے اس جیالے نے دروازہ کھول دیا۔

باہر کھڑا فقیر اپنا اجنبی چہرہ لئے ہوئے' ہاتھ پھیلاتا ہوا اندر کی جانب قدم اٹھانے لگا اور اندر کے لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ فقیر کچھ عجب شکل و شباہت کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجب قسم کی کشش تھی۔

وہ بڑا باوقار' رعب دار تھا' لوگ پیچھے ہٹے اور اس نے انہیں تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں! میں بھی انسان ہوں تمہارے ہی جیسا۔ میں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔ کچھ دینے آیا ہوں۔ تم بے چین تھے۔ سکون کے لئے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اندر کی دنیا کے سمٹے سمٹائے لوگ' تمہیں باہر کی دنیا کی دعوت دینے آیا ہوں۔ چلو میرے ساتھ آگے قدم بڑھاؤ۔ گھبراؤ نہیں میں تمہاری قیادت کروں گا۔"

سارے کے سارے لوگ جو گھبرائے ہوئے تھے ایک سکون کا احساس کرنے لگے مگر شکوک کی منزل ابھی بھی اپنا کام کر رہی تھی' مشکوک نگاہیں ابھی بھی انہیں گھور رہی تھیں۔

اس کے پیچھے چلنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ یہ سکون کہاں سے دے پائے گا؟ اس کے پاس ہے کیا؟ چہرہ بھی ہے تو عام انسانوں سے الگ' وضع

قطع بھی ہے تو ہم سبھوں سے جدا۔ نہ جانے کہاں لے جائے گا یہ ؟ کس منزل پر لے جا کر چھوڑے گا ہمیں ؟ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تم واپس جا سکتے ہو' ایک نے ہمت کر کے کہا۔

دوسرے نے کہا۔ "نہیں! نہیں!! تم جا سکتے ہو! تم کیوں چلے آئے تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم سکون کی تلاش میں ہیں"

تیسرے نے کہا۔ "یہ کوئی بہت بڑا جادوگر لگتا ہے۔ ہماری باتوں کو جان چکا ہے اور اب کسی گمراہی کے راستے پر لے جانا چاہتا ہے۔ نہیں' ہم نہیں جائیں گے۔ تم تنہا جاؤ"

نووارد کو کوئی ذریعہ اب تک حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ ان کا اعتماد حاصل کر سکتا۔ اس نے کہا "شک مت کرو۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ ں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔ میں تم کو غلط راستے پر بھی لے جانے نہیں آیا ہوں۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارے سکون کی خاطر آیا ہوں"

ایک نے پھر دریافت کیا۔ "تم کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم سب اضطراب میں ہیں اور سکون کی تلاش میں ہیں۔ نہیں بھائی' اپنا راستہ لو ہم دروازہ بند کریں گے۔"

نووارد نے کہا۔ "دروازہ بند نہیں ہوتا میرے عزیز! دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا ایک دروازہ کے بند کرنے سے کئی دروازے کھل جائیں گے اور ہر دروازہ تمہیں نئی آواز دے گا اس وقت فیصلہ تمہارے بس میں نہیں ہوگا۔ تم پاگل ہو جاؤ گے۔ تمہاری قوت فکر تمہیں جواب دے جائے گی۔ ایک ہی راستہ ہے دروازہ کھلا رہنے دو اور پھر دیکھو کہ فطرت کیا چاہتی ہے ؟

ہم کیا چاہتے ہیں؟ تم کیا چاہتے ہو۔؟"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی جانب سے آسمان میں بادل امنڈ آئے اور تاریکی چھاگئی۔ زناٹے دار ہواؤں نے دروازہ کے پٹ توڑ ڈالے اور بڑے زوروں کی گرج آسمان میں پیدا ہوئی۔

طوفان آ گیا! طوفان آ گیا!

"ہر طرف آندھیاں ہی آندھیاں ہیں۔ کس کمرے میں جاؤ گے؟ نووارد نے کہا۔"

کس دروازہ کو بند کرو گے؟ نووارد نے سوال کیا۔ کہاں پناہ لو گے میرے عزیز! طوفان بڑھتا جارہا ہے۔ جلدی فیصلہ کرو۔ اب تو دیواریں ہلنے لگی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر منہدم ہو جائے اور تم...... کہو کہاں ہے سکون؟ کس کس دروازہ کو بند کرو گے؟ اب تو صحرائے بسیط میں طوفان کا سامنا کرنا تمہاری قسمت بن چکا ہے۔ چلو میدان کی جانب ہم بھی نکلیں، تم بھی نکلو۔ دھرتی ڈول رہی ہے۔ ہیبت ناک آواز اٹھ رہی ہے۔ پل میں پرلے ہونے کو ہے۔ بادلوں کی گرج، ہواؤں کی زناٹے دار آواز۔ انتشار! انتشار! انہدام! انہدام! تخریب! تخریب! اور سکون کی تلاش میں تمہارا ذہن مفلوج ہو جائے گا عزیزم! چلو چلو، وہ دیکھو عقب کی دیوار گر پڑی۔ آگے کا راستہ ابھی کھلا ہے بند نہیں۔"

OOO

لفظوں کی موت

ہاں تو ہوا یہ تھا کہ ......

میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور کمرے کی چھت پر لگے فین کا سوئچ آن تھا، لیکن بجلی غائب تھی۔ نیچے فرش پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کا انبار لگا ہوا تھا۔ کاغذوں کے انبار کے درمیان سے ماچس کی تیلی چھانک رہی تھی۔

ادھر کمرے کے اندر گرمی اپنے شباب پر تھی اور میں ایک اضطرابی کیفیت میں گرفتار تھا۔ الماری میں رکھی تمام کتابیں مجھے دزدیدہ نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ وہ کتابیں جن میں میری روح بسا کرتی ہے۔ اگر یہ کتابیں نہیں رہیں گی تو میں بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ ٹھیک اسی

طرح جیسا کہ بچپن میں دادی ماں کہانی سنایا کرتی تھیں، جس میں ایک راکشش کی زندگی جنگل کے ویران کھنڈر میں قید طوطے میں رہتی تھی۔ اگر راکشش کو مارنا ہوتا تو طوطے کی گردن مروڑ دی جاتی تھی۔

ٹھیک یہی حالت میری ہے۔ اگر مجھے مارنا ہے تو میری کتابوں کو مجھ سے چھین لو۔

تم پاگل ہو گئے ہو کیا۔؟

"خاموش رہو! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایسے میں خطرہ خریدنے سے حاصل؟ ویسے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری شخصیت مسلّم رہے تو کاغذ پر بنے اس سرخ دائرہ کے اندر ہی کی باتیں کرو۔"

...... سرخ دائرہ سے باہر نکلو گے تو......

...... تو کیا ہو گا اس سے تم واقف ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے دادا اور پردادا کا حشر دیکھا ہے کہ انھوں نے جب میری بات نہیں مانی تو ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا۔

تمہارے دادا، پردادا اور ان کے سیکڑوں مریدان کی آوازیں وہ سامنے کے ٹیلے میں مدفون ہیں اور تمہارے دادا کے بیٹھنے کا جو چبوترہ تھا وہ ان کی آئڈیالوجی کے قبر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تمہارے دادا کے تمام مریدان کی آوازیں / آیئڈیالوجی سامنے کے ٹیلے میں دفن کر دی گئی ہیں۔ تم جیسے چند لوگ اس ٹیلے کی کھدائی کا کام شروع کرنا چاہتے ہیں اور اس ٹیلے کے اندر قید تمام آوازوں کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن حاصل کیا ہوتا ہے؟ اسے بھی تمہاری نگاہوں نے دیکھا ہے اور آئے دن تم یہ

تماشہ دیکھ رہے ہو۔

پھر اپنا وجود کیا تم کو پیارا نہیں

خاموشی مصلحت ہے!

خاموشی کو راہ دو!!

"اے بھائی!" تم کس کی اجازت سے کمرے میں داخل ہوئے۔ تم بہت بڑے جادوگر لگتے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے دادا کے تمام مرید ان کی آوازیں دفن ہو گئی ہیں۔ میں نے خاموشی سے تمہاری باتیں بہت سن لیں، اب ذرا میری بھی غور سے سن لو اور اپنی راہ لو۔

میں ان تمام دیواروں کو ڈھا دوں گا۔ جس میں میری آوازیں محفوظ ہو رہی ہیں۔ میں نے ان آوازوں کو جو ٹیلے کے اندر قید ہیں آزاد کرانے کی ٹھان لی ہے۔

آئڈیالوجی اگر سچ مچ آئڈیالوجی ہے تو مرتی نہیں، وقتی طور پر دب سکتی ہے میرے بھائی!! انتظار کرو کہ وہ جو ناکام دفن ہوئے۔ اگر وہ آئڈیالوجی کے حامل تھے تو ان کی روح پھر سے نئی نسل میں سرایت کر جائے گی۔

تم چاہتے ہو بھائی کہ میرا میں 'تمہارے میں' کی نمائندگی کرے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں سے کسی کا میں' جاگتا ہے۔ وہیں سے محکومی ختم ہو جاتی ہے۔ "میں" کی بیداری نوٹوں کی گڈی سے نہیں سلائی جا سکے گی...... خالق مجنوں ہوتا ہے کہ فن کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ بھوکا رہ کر فن کی پوجا کرتا ہے۔ فن کی تخلیق کر کے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔ جو بڑے سے بڑے دولت مند کو حاصل نہیں ہوتا۔

کسی شاہکار کی تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب آئڈیالوجی ساتھ ہو' اور شاہکار کی تخلیق کے بعد فنکار امر ہو جاتا ہے' اور دنیا کی ساری دولت اس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

...... یہ قلم اندھے جادوگر ہیں۔ سکّوں کی چمک سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ یہ تو دیوتا کے سمان سکّوں کا چڑھاوا لیتے رہتے ہیں"

اچانک بہت زوروں کا دھماکہ ہوتا ہے۔ انسانوں کی بستی والی سمت سے نہیں۔ بلکہ قلم اور مرغوں کی بستیوں کی طرف سے۔ اچانک ہونے والے اس دھماکے کی وجہ سے میں لرز اٹھتا ہوں اور اپنے پورے جسم کو ٹٹولنے لگتا ہوں۔ جب مجھے اپنی طرف سے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ میرا وجود ابھی مسلّم ہے۔ مجھ پر اس دھماکے کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ تب جا کر جلدی سے پورب' پچھّم' اتر' اور دکھن کی طرف نکلنے والی تمام کھڑکیوں کا پٹ کھول دیتا ہوں۔

سامنے کے مناظر کو دیکھ کر لرز اٹھتا ہوں۔ پورب کے میدان میں دوسری نسل کے مرغے گھس آئے ہیں اور زبردست جنگ شروع ہو گئی ہے اور ادھر پچھّم کی طرف قلم کی فوجوں پر تیزاب کی بارش ہو رہی تھی۔ چند ساعتوں کے بعد تیزاب کا سیلاب آجاتا ہے اور پھر جو کچھ ہوا اسے میری آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

میں نے پلٹ کر اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی ساری چیزیں اپنی جگہ پر تھیں لیکن وہ اجنبی شخص لاپتہ تھا۔ میں جلدی سے کمرے سے باہر آیا۔ لیکن دور دور تک اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

میں کمرے میں واپس آجاتا ہوں اور ایک بار پھر کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لیتا ہوں۔ سب اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں۔ دو چار قدم ادھر ادھر چلنے کے بعد دو اور کھڑکیاں کھول دیتا ہوں۔

کھڑکی کے باہر آسمان میں گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے' جو سورج کی کرنوں کو زمین تک پہنچنے سے روک رہے تھے اور چہار سو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ شاید اسی دھماکا کا ہی اثر تھا کہ باہر سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس دھماکہ سے نکلنے والی شعاؤں کا اثر اتنا شدید تھا کہ انسان اور جاندار سب اکھڑ رہے تھے۔

کھڑکیاں بند کر دیتا ہوں کہ اچانک میری نگاہ سرمائیہ حیات پر جا ٹکتی ہے۔ جہاں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ تمام کتابیں جل رہی تھیں اور نیچے فرش پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کے درمیان سے ماچس کی تیلی جھانک رہی تھی۔

یہ کیسے ہو گیا۔؟

آگ کس نے لگائی۔؟

آگ کیسے لگی۔؟؟؟

یہ کون سی پگلی ہوا کمرے میں داخل ہوئی کہ جس نے منٹوں میں سب کو بھسم کر ڈالا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے' اور میں چیخنے لگتا ہوں۔ دانتوں سے اپنے بدن کو کاٹنے لگتا ہوں۔ ناخنوں سے اپنے کپڑوں کو نوچنے لگتا ہوں۔

میرا جسم لہولہان ہو رہا ہے۔ میری انگلیاں سرخ ہو رہی ہیں اور ادھر الماری میں رکھی کتابوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔

کمرے میں گرمی شباب پر تھی کہ اچانک سیلنگ فین تیزی سے چلنے لگتا ہے۔ فرش پر بکھری ہوئی تخلیقات کے ارد گرد کے نوٹ ہوا کے جھونکوں سے اڑاڑ کر باہر جانے لگتے ہیں اور محلّہ کے لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے نوٹوں کو حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

برآمدے کے نیچے لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ کتابوں میں لگی آگ کو بجھائیں میری لاکھ کوششوں کے باوجود ساری کتابیں راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ میں راکھ سے لفظ کو نکالنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں کہ شاید کوئی لفظ آگ کی لپیٹ میں نہ آیا ہو۔ لیکن ایسا ہوا نہیں تھا۔

میں پاگلوں کی طرح راکھ کے درمیان سے آئڈیالوجی کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہوں اور تب سیلنگ فین کی ہوا سے راکھ دھیرے دھیرے کمرے میں اڑنے لگتی ہے۔ میں فرش پر گرے ہوئے قلم کو اٹھاتا ہوں۔ اس کی نب صحیح سلامت تھی۔ چند جملے لکھتا ہوں اور کاٹتا ہوں۔

آئڈیالوجی کی موت......×......×

لفظوں کی موت......×......×

اور قلم کی......

......

......؟؟

()()()

بابا

چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

اور ادھر تنہائی میں ذہن کی تیزی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کا حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جب کچھ حاصل نہیں تھا تو ذہن کی تیزی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کا حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جب کچھ حاصل نہیں تھا تو ذہن کی طراری بھی بے سود لگ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں کس سمت سے آ رہی تھیں اس کا تعین نہیں ہو پایا تھا کہ آوازیں رک گئیں اور اسی اثنا میں آنکھوں نے تاریکی میں دیکھنا سیکھ لیا۔

کیسی تاریکی۔؟

تاریکی جب لگاتار ہو تو زندگی کا معمول بن جاتی ہے۔ پھر تاریکی میں سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے اور سب کچھ یوں ہوتا ہے جیسے روشنی کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ تاریکی سب کچھ چھپا دیتی ہے۔ وہ چہرے جو دن کے اجالے میں کریہہ نظر آتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں ان سے کوئی کراہیت ظاہر نہیں ہوتی۔ اچھے اچھے لوگ جو وقار کے ساتھ رہتے ہیں، وقار کے لئے جیتے ہیں، وہ بھی تاریکی کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان کا وقار دنیا کی نظروں میں قائم رہ سکے۔

عامر عبداللہ مووِنگ چیئر پر بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے اور کمرے میں رکھی ساری چیزوں کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ فرش پر نہایت خوبصورت بچھی ہوئی قالین کا، شیشے کی کھڑکیوں کا، ڈریسنگ ٹیبل کا، ٹی وی کا، موسیقی کا، رقص کا، پرچھائیوں کا، مووِنگ چیئر کا......

مووِنگ چیئر

عامر عبداللہ

ڈریسنگ ٹیبل میں لگا چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا پلین مِرر

اور پلین مِرر کے ٹھیک سامنے والی دیوار پر لٹکا فریم

پلین مِرر

مووِنگ چیئر

دیوار پر لٹکا فریم

(فریم جس میں ایک تصویر قید ہے)

عامر عبداللہ مووِنگ چیئر پر بیٹھے ہیں۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرتا جارہا ہے۔ تھوڑی دیر میں پورا کمرہ دھواں سے بھر جاتا ہے۔ دھوئیں کی نکاسی کے لئے عامر عبداللہ جلدی سے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔

دھواں زائل ہوجاتا ہے۔ لیکن دھوئیں کے زائل ہوتے ہی چھ فٹ لمبے اور تین فٹ چوڑے سائز والے پلین مرر میں تصویر انلارج ہونے لگتی ہے' اور پھر دھیرے دھیرے پورے پلین مرر میں سماجاتی ہے۔

عامر عبداللہ خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔

پلین مرر میں یہ تصویر انلارج کیسے ہوگئی؟

پلین مرر پر کسی کیمیکل کا استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اور نہ ہی ڈریسنگ ٹیبل میں کمپیومر رفٹ کیا گیا تھا۔ کمرے میں کوئی آیا بھی نہ تھا تو پھر یہ تصویر انلارج کیسے ہوگئی......؟

عامر عبداللہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ پلین مرر سے ایک سایہ نکل کر دھیرے دھیرے ان کے قریب آنے لگا۔

سائے نے آدمی کی صورت اختیار کرلی۔

عامر عبداللہ پیچھے کی طرف بھاگتے ہیں۔

آواز آتی ہے......

"بیٹے عبداللہ تم نے مجھے پہچانا نہیں؟

اوں ہونہہ......

"ہاں' کیسے پہچانو گے؟ کیونکہ تم اپنی بینائی گنوا بیٹھے ہو۔ میں تمہارا بابا ہوں!"

"بابا......با......با......؟ تم......؟ لیکن تم تو دیوار کے اس پار......"

"ہاں میں! مجھے دیکھ کر تمہیں تعجب کیوں ہو رہا ہے!"

"نہ...... نہیں...... مجھے تعجب نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن تم میرے بابا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تمہارے بال لاوارث کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ تمہارا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ اور...... اور...... میرے بابا تمہارے جیسے بالکل نہیں تھے۔ تم بہت بڑے فراڈ لگتے ہو۔ گیٹ پر لگا نیم پلیٹ دیکھ کر گھس آئے ہو اور مجھے کسی جال میں پھنسانا چاہتے ہو"

"بیٹے کیا تم کو میری باتوں پر بھروسہ نہیں۔ یہ الگ سی بات ہے کہ میرا اصلی چہرہ مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ میرے سیاہ بال سفید ہو کر لاوارث کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوا کہ میں تمہارا بابا نہیں!"

چلو' اٹھو بیٹے۔ مجھ سے گلے مل جاؤ کہ تم سے ملنے کی تمنا ۲۵ برسوں سے مچل رہی تھی اور آج جب حالات نے تمہارے قریب لا کھڑا کیا تو...... تو ہوا یہ کہ میں اپنی شناخت کو کھو بیٹھا۔

آؤ ہاتھ ملاؤ! یہ تمہارے باپ کا ہاتھ ہے۔ تم بھول گئے عبداللہ ......رشتہ ختم کر دیا تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ مجھے تم سے علاحدہ کرنے والا کون تھا۔ نہ تم تھے اور نہ میں تھا۔ یہ وقت تھا میرے بیٹے! جس نے مجھے تم

سے علاحدہ کر دیا اور پھر میں اور تم ایک ایک حصہ کے وارث بن گئے۔
طاقت حاصل کرنے کے لئے حکومت حاصل کی جاتی ہے اور حکومت تو
ایک یا چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتی ہے۔ باقی لوگ تو جدا ہونے کا کرب
ہی محسوس کر سکتے ہیں......؟

ابے بڈھے! بہت لمبا لمبا بھاشن دیئے جا رہے ہو۔ چلو تھوڑی دیر
کے لئے مان لیتے ہیں کہ تم میرے بابا ہو' لیکن تمہارے پاس اس کا ثبوت ؟

"ہاں' بہت بڑا ثبوت ہے۔ یہ ...... یہ ...... یہ دیکھو ...... یہ جو سیاہ
نشان میرے بائیں بازو پر ہے۔ ایسا ہی ایک سیاہ نشان تمہارے بازو پر ہوگا۔"

عامر عبداللہ جلدی سے آستین چڑھا کر اپنے بائیں بازو کو دیکھتے ہیں۔
ان کے حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوا۔ بالکل ایک طرح کے نشان'
دھندلکے میں کچھ یاد آیا۔

جب آٹھ سال کا تھا' تو ماں نے 'م ......ا......ں نے کہا تھا۔
"تیرے بابا کے بائیں بازو پر سیاہ نشان ہے۔ اسی سیاہ نشان سے تو اپنے بابا کو
پہچان لے گا۔"

بابا جو دیوار کے اس پار چلے گئے اور ماں......

بابا' اتنے طویل عرصہ میں تم نے دیوار کو کم کرنے کی کوشش
کیوں نہیں کی؟"

بیٹے! میں نے جب جب دیوار کو کم کرنے کی کوشش کی تب تب
دیوار اور اونچی ہوتی چلی گئی۔ لیکن اب دیواروں کا سلسلہ جو دور تک جاتا تھا۔
ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم پھر ایک ہو گئے ہیں۔ کوئی اب ہم دونوں کو ایک

دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔

......

......

بابا......!

بابا......!!

......

......

بابا نہ جانے کتنی دیر تک دوسری دنیا میں کھوئے رہے۔ صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے حال میں قدم رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ شاید انہیں 'میں' کی تلاش تھی جو دیوار کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔

"بابا......بابا...... تم کہاں کھو گئے ؟"

"آں......آں...... کہیں نہیں! میں سوچ رہا ہوں کہ آج تیری ماں......"

بابا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بچّوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں۔ بابا تم کیوں رو رہے ہو۔ دیکھو میں بوڑھوں کی طرح خاموش ہوں اور تم بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے ہو۔ بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ ؟"

"بیٹے! میں بیتے ہوئے لمحوں سے جنگ کر رہا ہوں۔ تمہارے دادا نے اپنے دادا سے جنگ کی ہوگی۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے کیونکہ جنگ ہی سے جنگ کا مداوا ہوتا ہے۔ جنگ ہی سے امن بھی قائم ہوتا ہے اور جنگ ہی سے زندگی آگے بڑھتی ہے"

دھرتی ایک دیواریں ان گنت ...... اور ہر دیوار پر ایک منحوس پرندہ بیٹھا ہے۔ جس کی چونچ سے خون ٹپک رہا ہے اور آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔

دادا

دیواریں

جنگل

بیٹے! میرے اندر بڑے بڑے سیکڑوں درخت اُگ آئے ہیں۔ ہر درخت کی جڑ میں تمہارے پرکھوں کی روایت دفن ہے۔ تمہارے دادا' تمہاری دادی' تمہارے پرنانا' تمہاری پرنانی...... 'سب انہیں جڑوں میں دفن ہیں۔ میں نے جب جب جڑوں کو کریدنے کی کوشش کی تب تب دھرتی پھٹی اور میرا پورا وجود دھرتی میں سمانے لگا اور تب مجھے محسوس ہوا کہ میں درخت میں تبدیل ہو رہا ہوں۔"

بابا' کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ جن جن لوگوں نے جڑوں کو کریدنے کی کوشش کی ان کا پورا وجود دھرتی میں سما گیا اور پھر وہ درخت میں تبدیل ہو گئے۔

"ہاں' ایسا ہی ہوا۔ لیکن یہ جنگل کی بات کہاں سے نکل گئی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ میرا وجود خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ اندھیرا گھرا ہوتا جا رہا ہے۔"

اندھیرا......

جنگل......

سایہ......

''ایک خوفناک سایہ میرے قریب آرہا ہے بیٹے!''

''بابا! یہ تو تمہارا اپنا سایہ ہے''

''لیکن اندھیرے میں سایے کا وجود کہاں؟''

'' اب اندھیرا کہاں ہے بابا' درختوں کی جڑوں میں دفن زندہ لاشوں کی ہڈیوں کے فاسفورس سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔''

'' نہیں! نہیں!! یہ کوئی راکشش ہے' نادان مت بنو' مجھے یہاں سے جلدی لے چلو' دیکھا تم نے سائے نے راکشش کی صورت اختیار کر لی' دیکھو وہ تیز تیز قدموں سے میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے' بیٹے! یہ دیکھو...... یہ...... یہ میرا گلا دبانا چاہ رہا ہے۔''

''بابا' مجھے تو کوئی ہاتھ کوئی سایہ نظر نہیں آرہا ہے''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ زوردار دھماکہ ہوتا ہے' فضا میں ایک چیخ لہراتی ہے اور سارے درخت زمین میں دفن ہونے لگتے ہیں۔

عامر عبداللہ کو اپنا وزن ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے ان کے جسم میں ہائڈروجن گیس بھر دی گئی ہو۔ وہ اوپر اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن چھت سے ٹکرا پلین مرر کے پاس گر پڑتے ہیں۔

پلین مرر چکنا چور ہو چکا تھا اور ٹوٹنے کا ارتعاش فضا میں نغمگی گھول رہا تھا۔

()()()

چلتی رکتی گاڑی کے بیچ

چلتی گاڑی کے تجربے بھی عجب ہوتے ہیں۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے چلتی ہے اور مسافر اس کے اندر بیٹھا رہتا ہے۔ رفتار سے بے نیاز' اپنے معمول میں کھویا ہوا۔ اس وقت اسے باہر کی ہر چیز چلتی دکھائی دیتی ہے اور وہ خود کو رکا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ جب ترقی کی رفتار بڑھی ہے تو انسان کی رفتار رک گئی ہے۔ مگر انسان اس کے بعد بھی ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ٹرین اپنی رفتار سے چلی جا رہی ہے۔ ناول میرے ہاتھ میں ہے اور میں دائروں کی شکست میں کھویا ہوا ہوں' اچانک گاڑی رکتی ہے اور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہیں۔

افراتفری سی مچ جاتی ہے اور میرا ناول بھی اس بھیڑ میں میرے ہاتھ سے گر جاتا ہے۔ دائروں کی شکست کا منظر میری نگاہوں سے او جھل ہو جاتا ہے۔ اور میری خواہش حالیہ حالات سے نبرد آزما ہو جاتی ہے۔

کشمکش۔ معنی کی تلاش۔ افسردگی۔ جھنجھلاہٹ اور میں! ناول ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کوئی ایک جملہ ساگس دیتا ہے۔ اتنی بھیڑ میں "ناول خوانی چہ خوب" بھانت بھانت کی آوازیں، سرگوشیاں، قہقہے۔ لیکن میرا ذہن ایک نقطہ پر مرکوز۔ کیسا نقطہ ہے یہ؟

احساس کی تلاش۔ تجسّس کا اضطراب۔ گاڑی کی سیٹی، اور پھر گاڑی چلنے لگتی ہے۔ ماحول پر سکون ہو جاتا ہے۔ شاید کہ رفتار کا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔ دنیا گھوم رہی ہے اور انسان ساکت!

منجمد ہیبت ناک سکوت! مگر پیچھے کی طرف مڑ کر کون دیکھتا ہے۔ اتنی فرصت کسے ہے کہ افراد کو دیکھے اور ان کی کشمکش پر غور کرے ابھی میں نے سگریٹ جلائی ہے۔ دھوئیں کا مرغولا چھوڑ تا جا رہا ہوں اور میرا ذہن ان سے بنے دائروں پر غور کر رہا ہے۔ دائرے بنتے ہیں پھر ان کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ دھواں فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

خیالات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے کہ اچانک بریک لگ جاتا ہے "ایک پیسہ دے دو" کی آواز مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹا کٹا انسان بھیک مانگ رہا ہے۔ تندرست بھی ہے اور

توانا بھی۔ معلوم نہیں کون سی شکست سے آشنا ہے۔ پڑھا لکھا دکھائی دیتا ہے۔ شکستگی کا احساس چہرے پر نمایاں ہے۔ شکست و ریخت تو مقدر ہے۔ لیکن یہ فرار...... ؟ نہیں حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے...... سعی پیہم...... وہ آگے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس فرصت نہیں ہے کہ میری تقریر سنے۔ میرے ذہن میں خیالات کے نئے مرغولے بننے لگتے ہیں۔ ایک مرغولہ دوسرے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ دائرے بنتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔

دھواں دھواں دائرے بن رہے ہیں فضائے بسیط میں چہرے کیوں مسخ ہو رہے ہیں ؟ پڑھا لکھا، تندرست و توانا آدمی بھیک مانگ رہا ہے ؟ تہذیب ارتقا پزیر ہے اور ہم...... ؟ ؟ ؟

قدریں شکست کھا چکی ہیں۔ نئی قدروں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اب کوئی اپاہج بھیک نہیں مانگے گا۔ اب کوئی نادار بھیک نہین مانگے گا۔ اب تو ہٹے کٹے بھیک مانگیں گے۔ نئی قدروں کا یہ بڑا تحفہ ہے۔ ہم مہذب ہیں، انسانیت عروج پر ہے۔ تہذیب کی گاڑی چل رہی ہے اور ہم، شاید ہم بھی ترقی کر رہے ہیں۔

ہاں یہ ترقی ہی تو ہے۔

میرا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ کس کو فرصت ہے، میرے چہرے کو پہچانے۔ کس کو حاجت ہے کہ ان کھوئی ہوئی قدروں کا ماتم کرے۔

کوئی بھیک منگا آتا ہے دستک دیتا ہے۔ اور ناول پڑھنے والوں کی

تنقید بھیک منگے کو آگے بڑھا دیتی ہے یہ سلسلہ ہر چلتی ہوئی ٹرین میں جاری رہتا ہے۔ ٹرین چلتی ہی جاتی ہے اسے کیا پتہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کے اندر بیٹھے مسافر کیا کر رہے ہیں ؟۔

گاڑی رکتی ہے۔ مسافروں کا سیلاب آتا ہے۔ اور سکون سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو جھٹکے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ مگر احساس نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ ان جھٹکوں کی کوئی مستقل شکل نہیں بن پاتی' یہ جھٹکے بھی۔ مرغولے کے مانند مسخ ہو رہے ہیں۔ میں چل رہا ہوں۔ میں تہذیب یافتہ ہوں۔ میں انسان ہوں' میری ہر ادا میرے ارتقاء کا اعلان ہے اور میرا ہی انداز نئی تہذیب اور نئے اقدار کو جنم دے رہا ہے ان اقدار کے دامن میں کوئی ہٹا کٹا آدمی پڑھ لکھ کر بھیک مانگ رہا ہے۔ ہم عروج پر ہیں ۔قدریں ٹوٹی ہیں۔ نئی قدروں نے نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت کا مسئلہ کتنا لا متناہی ہے۔

کرب کی آواز چہار طرف سنائی دے رہی ہے۔ کون ہے جو اس کا مداوا کرے۔؟ بیمار کون ہے ؟ معالج کون ہے ؟ ان داتا کہاں گیا ......؟؟ خداؤں کی خدائی کتنی حسرت ناک ہو گئی ہے۔ مرغولے بنتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ ناول میرے ہاتھ میں ہے۔ مگر نہ جانے دائروں کی شکست کب ختم ہو گی......؟؟

OOO

دائروں کا قیدی

وقت تیز رفتاری سے گزر رہا ہے' اور انسان وقت کے ہمقدم ہونے میں منہمک ہے۔ کبھی وقت انسان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور کبھی انسان وقت کو۔ مگر وقت ایک حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے فنا جس کی تقدیر میں نہیں۔ انسان اس حقیقت کے درمیان اپنے عمل کے ذریعہ اپنے آپ کو ایک حقیقت ثابت کرنا چاہتا ہے۔

وقت تیزی سے آگے بڑھ گیا ہے اور زندگی جگمگا اٹھی ہے۔ مگر یہ جگمگاہٹ' یہ روشنی محض شہروں کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ وقت دیہاتوں میں نہیں بدلتا' قصبوں میں نہیں بدلتا اور اگر بدلتا بھی ہے تو اس میں بہت دیر لگتی ہے۔ کیونکہ قصبے کبھی لہروں کا ساتھ نہیں دیتے' یا کبھی

وقت کی لہریں دیہاتوں اور قصبوں سے کترا کر نکل جاتی ہیں۔

میں نے اپنے وجود کو وقت کے دھارے میں ڈال دیا ہے اور لا شعوری طور پر وقت کے ساتھ بہا جا رہا ہوں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ میری کشتی کسی کنارے لگ جاتی ہے اور میں ایک چٹان پر بیٹھ جاتا ہوں۔ چٹان سے لگ کر ایک ندی بہہ رہی ہے اور میں اپنے تھیلے کی کنکریاں نکال کر یکے بعد دیگرے پھینکنے لگتا ہوں۔ دائرے بنتے ہیں اور پھر مسخ ہو جاتے ہیں۔ دائرے کے اندر دائرہ اور دائرے کے گرد دائرہ۔ میری آنکھیں ان دائروں پر مرکوز ہیں۔ ان دائروں کے درمیان اچانک میرا ماضی جھانکنے لگتا ہے۔ میں خود کو ایک چہار دیواری کا قیدی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ایک معمول! ایک سے شب و روز!!

سکریٹریٹ کی سروس۔ دن بھر ٹائپ رائٹنگ کی کھٹا کھٹ' نوٹس تیار کرو۔ ادھر جوڑ ادھر گھٹاؤ' پھر شام کے وقت گھر کے اندر کے مشاغل۔ آشی کی جھڑپ' روشی کی فرمائشیں۔ پھر اس ہنگامے میں شام کا گزر جانا اور رات کی تاریکی میں شاندار مستقبل کی تعمیر کرنا۔ اس طرح شب و روز گزر جاتے ہیں۔ ایک سے ماحول' ایک سی حالت کا عادی ہو گیا ہوں' یا یہ احوال عادی ہو گئے ہیں۔ یہ فیصلہ ابھی نہیں ہو سکا ہے۔

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ پہلی تاریخ کی آمد آمد ہے۔ روٹی کے مسئلے کے علاوہ بیٹی کی بھی فرمائشوں کا خیال رکھنا ہے' اور پھر جب بجٹ بنتا ہے تو روٹی کے چار کور ہی بہت مشکل سے تیار ہو پاتے ہیں۔ فرمائشیں تو محض خیالات کے مرغولے بنا کر غائب ہو جاتی ہیں۔ پاس پڑوس میں

موٹریں ہوں' ٹی وی ہوں' دولت کا انبار ہو' سجا ہوا مکان وغیرہ جیسے عیش کے سامان ہوں۔ لیکن اس کے مقابل رہنے والے سکریٹریٹ کے بڑے بابو کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو وقت اسے کیوں کر خوبصورت دکھائی دے گا۔ وقت کا چکر چلتا رہتا ہے اور انسان تقدیر کی دہائی دیتا رہتا ہے۔ کہیں بہتری اور کہیں ابتری کے نشانات ہیں۔ کل کارخانے چل رہے ہیں PRODUCTION بڑھانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر زندگی بس ایک سمت میں رواں ہے۔ ایک دائرے میں محصور ہے۔

روشنی بجھ گئی ہے' اور خیالات کی شمع روشن ہو چکی ہے۔ رات کے وقت آفس سے آکر نیند نے غلبہ پایا ہے تو خواب میں وہ سب کچھ نظر آرہا ہے۔ جسے ہم ترقی کے اسباب کہتے ہیں۔ میں دائرے سے باہر نکلنا چاہتا ہوں اور دائرے کا محیط پھیلتا جاتا ہے دائرے کی دیوار اونچی ہوتی جاتی ہے۔ میری قسمت کی چہار دیواری جو باپ دادا نے بنا کر رکھ دی ہے اسے تو خاندان کی عزت کے طور پر مجھے برقرار رکھنا ہی ہے۔ میں اس سے نکلنے کی کوشش کیوں کروں۔ ؟

مگر اس چہار دیواری کے اندر تو صرف تاریکی ہی ہے۔ مجھے روشنی بھی تو چاہیئے۔ میں نے دائرے سے باہر جھانکنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا۔ باہر کی دنیا' کچھ اور ہی ہے۔ وہاں روشنی ہے' بھاگ دوڑ ہے' موٹر ہے' بنگلہ ہے اور قسمت کی تجوری ہے۔ یہ تجوری بھی مجھے مل سکتی ہے۔ میں بھی بنگلہ ٹی وی اور عیش کی دنیا کا مالک بن سکتا ہوں۔ مگر کب ؟ مجھے اپنے آپ کو بدلنا ہو گا۔ دل کی قلعی کر کے اس پر تصنع کی مہر

لگانی ہو گی۔ خلوص اور محبت کو اضافی قرار دینا ہو گا۔ ترقی کے لئے تنزلی کا اپنانا بہت ضروری ہے۔ تبھی آشی اور روشی بھی مطمئن ہو سکیں گے۔

اب میں ایک کنکری سے ایک دائرہ بناتا ہوں اور دوسرے دائرہ کو توڑنے لگتا ہوں۔ مگر دائرے' دائرے ہیں ان کے حدود بار بار نمایاں ہوتے ہیں اور مجھے حدود سے نفرت ہو چکی ہے۔ کوئی روح آواز دے رہی ہے۔ دائرے بنانا چھوڑ دو۔ دائرے خود ساختہ ہیں۔ دائرے کی اہمیت کیا۔ تم ایک سمت میں دوڑ جاؤ۔

مگر میں کس سمت میں دوڑوں۔ دائرے کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ جس طرف سے دائرے توڑے جائیں ادھر سے ایک سمت نکلتی ہے پھر سوال یہ ہے کہ کون سی سمت کام آئے گی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے اور میں چیخنے لگتا ہوں۔ میری کنکریاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ آسماں بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔ بارش ہونے لگی ہے اور میں قوس قزح کے انتظار میں ایک سمت چہرہ کر کے دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید کوئی روشنی پھوٹے اور دائروں کا سلسلہ ختم ہو۔

()()()

آگ لگنے کے بعد

آگ...... آگ...... شعلہ یہ کیا ہو گیا؟

دیکھتے دیکھتے سارا مکان لہک اٹھا۔ دھواں' شعلہ اور گرمی' اس پر چیختے بلکتے بچے' بوڑھے اور سینہ پیٹتی ہوئی عورتیں۔ ایک خلفشار سا مچ گیا تھا۔ شور اور ہنگامے نے پاس پڑوس کی ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوا تیز ہوتی جارہی تھی۔

پھر ہوتا یوں ہے کہ اچانک آگ بجھنے لگی اور دھواں سا پھیلنے لگا۔ لوگ دھوئیں سے تنگ آکر کنارے ہٹنے لگے ۔ جلتا ہوا مکان اب دھوئیں کا مسکن بن گیا تھا۔ پھر آگ سرد ہو گئی۔ دھواں بھی زائل ہو گیا۔ یہاں تک کہ آگ اور دھواں ایک کہانی بن کر رہ گیا۔ مگر مالک مکان کو

ایک الگ پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ اس کے جسم پر ایک چنگاری آ کر کام کر گئی تھی اور اس کا سارا جسم اس طرح لہک رہا تھا جیسے ساری آگ اس کے جسم میں بھر دی گئی ہو۔ کبھی کبھی فطرت کا مذاق بھی عجیب ہوتا ہے۔ آتش بازی بنانے والا وہ شخص آج خود آتش بازی کی طرح اندر ہی اندر سُلگ رہا تھا۔

آگ کیوں لگتی ہے؟

آگ لگتی ہے، یا لگائی جاتی ہے؟؟

آگ تو تہذیب کی نشانی ہے اور تہذیب ہمیشہ حسن کی قائل ہوتی ہے۔ مگر یہ آگ تو سب کچھ کالا کر رہی تھی اور جو کالا نہ ہوتا تھا اس کا بھسم بنا دے رہی تھی۔

میں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن و دماغ میں آگ کے شعلے اٹھنے لگے اور نگاہوں کے سامنے چنگاریوں کا ایک ہجوم سا لگ گیا۔ میں چلاّنے لگا۔ آگ لگ گئی ہے۔ بجھاؤ، بجھاؤ۔ مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں جلتا رہا اور میرا اندرون خاکستر ہوتا رہا۔ میرا ایک دوست جو مجھ سے بہت قریب تھا۔ میرا گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر، مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ، کہیں وہ بھی نہ جلنے لگے۔ مگر میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھ سے لپٹا رہا اور میں اسے ٹالتا رہا۔ مگر ہُوا یہ کہ آگ کی ایک چنگاری اسے بھی لگ گئی اور پھر ہم دونوں پانی کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ ہم دونوں پاگلوں کی طرح ایک سمت دوڑے جا رہے تھے اور زمانہ ہمیں مجنوں سمجھ کر ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ راستہ آگے بڑھتا رہا۔

ہم چلتے رہے۔ چلتے چلتے ہم ایک بستی میں آئے۔ یہ تالابوں کی بستی تھی۔ یہاں ہماری سوزش کم ہوتی۔ مگر جب پہنچا تو محسوس ہوا کہ تالاب سراب بن گئے ہیں اور ان کا پانی' پانی نہیں رہا ہے۔ وہ ریت کی طرح تبدیل ہو کر جل رہے تھے۔ اب ہمارے سامنے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری جان نکل جائے گی' اور ہم خاک کے تودا ہو کر رہ جائیں گے۔

ہم دونوں نے پھر ہمت کر کے آگے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑ پر پہنچے' اور اوپر کی طرف چلنے لگے ابھی پوری طرح سے چوٹی پر گئے بھی نہ تھے کہ محسوس ہوا ہماری چنگاری شعلہ بن رہی ہے اور اس نے پہاڑ کی ساری چوٹی کو منور کر رکھا ہے۔ بستی کے ارد گرد لوگ اس نور کو دیکھنے کی خاطر جمع ہوئے ہیں اور ہم ہیں کہ اس آگ کے عادی بن گئے ہیں' ہمارا بدن آگ کا بن چکا ہے۔ اب ہم دوسروں کو جلا سکتے ہیں۔ ہم روشنی پیدا کر سکتے ہیں' مگر خود سوزش محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آگ نے ہم کو آگ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب ہم خود جلتے ہیں' جلاتے ہیں کہ جلنا اور جلانا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔

OOO

سوالیہ نشان کے نیچے کا نقطہ

افسانے کا پلاٹ ذہن میں بنارہ گیا اور قلم کی روشنائی ٹیبل پر رکھے کاغذ کی طرف دیکھتے دیکھتے خشک ہو گئی۔

کمرے سے باہر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ماجرا دو ہاتھوں کا تھا۔ ان دو ہاتھوں کا جنھوں نے قتل وغارت گری کی ایک بے مثال کہانی تیار کرلی تھی۔

کمرے کے اندر خاموشی بھایانک ہوتی جارہی تھی۔ ذہن باہر کے ہنگامے پر لگا ہوا تھا۔ اچانک ساری روشنی گل ہوگئی اور آنکھوں کے سامنے تاریکیوں کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک آوازیں آنی بند ہوگئیں۔ مگر اس کا تعین نہیں ہو پایا تھا کہ آخر آوازیں رک کیوں گئیں؟ تاریکی سابق دستور تھیں۔

مگر آنکھوں نے ان تاریکیوں میں بھی سب کچھ دیکھنا سیکھ لیا تھا۔ اب روشنی کی ضرورت بھی کیا تھی۔ تاریکی میں سب کچھ پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ ذہن زیادہ چوکنا ہوتا ہے۔ ایسے میں ذہن کا عمل کچھ چمکار بھی دکھلاتا ہے۔

ابھی پوری طرح سے منظر کھل کر سامنے نہیں آیا تھا کہ دو ہاتھ فضا میں جھولتے دکھائی دیئے۔ وہ یہی دو ہاتھ تھے جنھوں نے شہر کی آبادیوں میں طوفان برپا کر دیا تھا اور ہر طرف زمین کو سرخی بخش رہے تھے۔

یہ کس کے ہاتھ تھے؟

کس بازو سے لگے ہوئے تھے؟؟

یہ سب کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مگر یہ ہاتھ تھے اور یقیناً کسی وجود کے ہاتھ تھے۔ فضا میں معلق ہونے کا یہ مفہوم کبھی نہیں تھا کہ ان کے پیچھے کسی وجود کی طاقت نہیں تھی۔ کوئی دماغ تو ہوگا جو انہیں حرکت میں لا رہا ہوگا۔ کوئی اعصابی طاقت بھی ہوگی جو اس کو طاقت بخش رہی ہوگی۔

یہ دونوں ہاتھ چلتے چلتے اچانک میرے بالکل قریب آگئے۔ ٹھیک میرے ٹیبل کے نزدیک، جس پر ان کی کہی کہانی کا پلاٹ بنتے بنتے رہ گیا تھا ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دو ہاتھ مجھے قتل کر دیں گے۔ پھر یہ بھی احساس تھا کہ ایسا نہیں کر سکتے کہ یہ بے جسم و جان کے صرف ہاتھ تھے اور میں مسلّم ایک شخصیت تھا۔ ایسی شخصیت جو منظّم ہوتی ہے۔ دماغ اور اعصاب جس کو توازن بخشتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرا دماغ معطل ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ گردش کر رہے تھے اور میں ایک سراسمگی کا شکار تھا۔ دماغ پر ہلچل سی بپا تھی دل کہہ رہا تھا کہ ہمّت سے آگے بڑھ کر

ان ہاتھوں کو گرفت میں لے لوں مگر کسی نے طاقت ہی چھین لی تھی۔ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی کرنا ناممکن تھا۔ ان سے دریافت بھی کرنا چاہتا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ زمین کے رنگنے سے تمہیں کیا ملے گا؟؟

انسانیت کا خون بہانے سے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ تو ویسے ہی تھے۔ جیسے ہمارے ہوں شکل وصورت ایک' رنگ وروپ بھی تقریباً ایک ہی تھے۔ ایک ہی کوکھ سے نکلے ہوئے بھی یہ ہاتھ تھے۔ وہ بھائی کے ہی ہاتھ تھے۔ ایسا لگتا تھا ایک ماں کی کوکھ سے جنم لے کر الگ وجود میں بٹ گئے تھے۔ مگر اتنی جلدی پیار کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ دوستی ختم نہیں ہو جاتی۔

میں ان ہاتھوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ بھائی' رشتہ کیوں ختم کر دیا تم نے! پھر سوچتا ہوں کہ کوئی تو ہے جو ان دو ہاتھوں کو دو کر رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو انہیں' دائیں اور بائیں بازو کا فرق بتلا رہا ہے مگر وہ ہے کون؟

کس نے انہیں ماں کی کوکھ کا الگ الگ وارث بنایا اور ترکے کے لئے لڑا دیا ہے۔ مل جائیں تو یہ ہاتھ بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ جدا ہو کر اتنے ہی کمزور بھی ہو جاتے ہیں۔ طاقت بھی ان ہی ہاتھوں سے ملتی ہے۔ حکومت بھی یہی ہاتھ کرتے ہیں۔ تعمیر اور تخریب دونوں کے یہ ضامن ہیں۔ یہ ہاتھ اب کبھی نہیں ملیں گے کہ شاید کاتب تقدیر نے دائیں اور بائیں بازو پر رکھ کر بروز ازل جدائی ان کی تقدیر بنا دی ہے۔ تاہم اس مسئلہ کا حل تو چاہئے کہ فضا میں لہراتے وہ دو ہاتھ کس نے بھیجے ہیں؟

کس کے ہیں بس آمادۂ تخریب نظر آتے ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہی نہیں۔ خون کی ندیاں بہانے پر تلے ہیں۔ کیا مزہ ملتا ہے انہیں اس کام میں ؟ کیا ان ہاتھوں کا ضمیر سو گیا ہے ؟ مگر ہاتھوں کا تو ضمیر نہیں ہوتا ضمیر کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور دماغ سے۔ یہ تو میکانیکی ہاتھ ہیں۔ جو بس بڑھے چلے آرہے ہیں۔ میری گردن کے قریب آچکے ہیں۔ میں چلاّتا ہوں۔ بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اب ان کی گرفت سے نکلنا مشکل ہو چکا ہے۔ میری بے بسی اس بات کی متقاضی ہے کہ میں بھی انتقاماً پیاسی دھرتی کو خون کی موجوں سے سیراب کردوں زمین پر ایک ہنگامہ خیز منظر برپا کردوں۔ طوفان لے آؤں۔ زلزلہ پیدا کردوں۔ دھرتی میں دراریں ڈال دوں۔ مگر میرے ہاتھ' میرے بس میں نہیں ہیں۔ اب میرے ہاتھ بھی اس کے کام آرہے ہیں۔ جس نے اقتدار کے لئے اور بس اقتدار کے لئے جینا سیکھا ہے۔ میں بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر ان ہاتھوں کو جو فضا میں جھول رہے تھے' سمجھانا چاہتا ہوں کہ آنے والا لمحہ تم کو کیا دے گا۔ اس نے کسی کو کیا دیا ہے۔ مجھ کو کیا دے گا۔ میں کہاں ہوں گا۔ تم کہاں ہو گے ؟؟؟ ان باتوں کا جواب آؤ ہم تم مل کر سوالیہ نشان کے نیچے لگے ہوئے نقطے میں تلاش کریں۔

مگر وہ ہاتھ بے نیاز رہتے ہیں۔ میری باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے اور میری گردن دبانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں میری زبان کو بھی گُنگ لگ جاتی ہے۔ آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ اسی اثناء اچانک دھماکا سا ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ہاتھ میری گردن سے علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے گوڈسے مسکراتا رہتا ہے۔ گاندھی جی

کی خون آلود لاش عوام کے سامنے رکھی ہوتی ہے اور ان ہاتھوں سے آواز آتی ہے۔

ظلم زندہ رہ جاتا ہے۔ انصاف مر چکا ہے۔ اس لئے کہ انصاف میں مارنے کی سکت نہیں ہوتی۔ زندہ وہی رہتا ہے جو موت کو بھی قبضے میں رکھے۔ اس کے بعد وہ دو ہاتھ کہتے ہیں۔

''ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی مظلومیت کا رونا روتے رہو۔ اپنی سسکیوں میں انقلاب تلاش کرو۔ صرف انقلاب کے خواب دیکھنا تمہارا کام ہے۔ ستیہ اور اہنسا سے کبھی انقلاب نہیں آتا۔ ستیہ اور اہنسا بھی بڑی طاقتوں کے لئے ایک آلہ کار ہے۔ ستیہ 'اہنسا اور ہندستان کی آزادی' یورپ مسکراتا ہے۔ غیر ملکی طاقتیں شطرنج کی بساط پر شہ کو مات دے جاتی ہیں۔ ذہنی غلامی۔ گردن کا طوق۔ پس منظر بدل گیا......''

یہ سب کچھ کہتے ہوئے ان دو ہاتھوں نے اچانک میری گردن اپنی گرفت میں لے لی۔ فضا میں ایک چیخ لہرائی۔ سناٹا سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولس تفتیش کر رہی تھی۔۔ وہ لوگوں سے پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ دو ہاتھ کون تھے؟ کس کے تھے؟ کدھر سے آئے تھے؟ کہاں چلے گئے؟؟؟

اتنے میں کسی نے انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ لاش گاڑی پر لاد کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی۔ شہر معمول پر آگیا۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ قائم رہا کہ وہ دو ہاتھ کون تھے اور کس کے تھے؟؟؟

OOOO

نروان

ہمارے سامنے وہ جو ایک دائرہ سا نظر آرہا ہے۔ اپنی معنویت کے اعتبار سے بڑا پراسرار ہے۔ میں اس کو دیکھ کر تخیُّل میں کھو جاتا ہوں اور جوں جوں میرے تخیُّل کا سفر آگے بڑھتا ہے۔ دائرہ اپنی پے چیدگی میں بے مثال ہوتا جاتا ہے یہاں تک کے پھر دائرہ دائرہ رہ جاتا ہے اور میں......؟

انجانی سی سرگوشی ہوتی ہے۔ دھماکے کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ افق میں لہریں اٹھتی ہیں اور پھر بھیانک تاریکی سی پھیل جاتی ہے۔

تاریکی کا راج اور دائرہ کی وسعت۔ ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ سو گیا ہے۔ نیند کا غلبہ کچھ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ دماغ کی ساری جوت ختم ہو چکی ہے۔ مگر کبھی کبھی تاریکی ہی روشنی کی ضامن بن جاتی ہے۔ تاریکی اور

روشنی کا رشتہ تو بہت پُرانا ہے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر جانا نہیں جا سکتا۔ مگر ایک کو دوسرے کے درمیان دیکھا بھی نہیں جا سکتا یہی کشمکش ازل سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔؟

میں حیرت زدہ کھڑا ہوں۔ نیند کا غلبہ ذہن پر طاری ہے اور اسی درمیان مجھے ایسا لگتا ہے کہ دائرے کے بیچ ایک چراغ جل اٹھا ہے۔ روشنی کا حلقہ تاریکی کو متزلزل کر رہا ہے ار پھر نئے سرے سے تاریکی اور روشنی کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ روشنی دائرے کو لپیٹ میں لینا چاہتی ہے۔ تاریکی اپنی وسعت پھیلائے جاتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی روشنی کے حدود تنگ نظر آتے ہیں اور کبھی تاریکی مدھم سی ہونے لگتی ہے۔

وجود کے قیام کا مسئلہ۔۔ جدو جہد کی صورت۔۔ فضا کی پُر اسرار ہیبت ناکی۔۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟۔۔ کیا ہے؟۔۔ کس کا امتحان ہے؟ ۔۔ وجود ازلی نے یہ کیا مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے۔۔ کس کا حل کب ہوگا۔۔ کہاں سے گوتم نیلا مبر آئے گا۔۔ کون سی نئی دنیا بسائے گا۔۔ نروان کی روشنی مدھم ہو چکی ہے۔۔ گوتم رو رہا ہے۔۔ تاریکی بڑھتی جارہی ہے ۔۔۔ پیپل کا پیڑ بھی خاموش ہے۔ امام مہدی آئیں گے۔؟؟

پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ہو چکا ہے۔ انسانیت کسی امام موعود کے انتظار میں ہے۔

ہم کہاں ہیں' یہ سوال اپنی جگہ پر ہے۔ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا یہ سب تاریکی ہے اور سب تاریکی ہے تو ہم کیا ہیں۔۔۔ ہم بھی تو تاریکی ہیں۔۔؟

خاموش رہو! فضا اور پر اسرار ہوتی جا رہی ہے۔ چیل و چمگادڑ کی آواز۔ ہوا کی سنسناہٹ اور کتے کے بھونکنے کی آواز۔

چراغ بجھ چکا ہے اور دائرے کی تاریکی عروج پر ہے۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو! وہاں دیکھ لینے دو۔۔ ہم مسخ ہو رہے ہیں۔۔ ہم بجھ رہے ہیں۔۔ ہم کہاں ہیں۔۔ ہم کیوں ہیں۔۔ میرا دماغ بجھ رہا ہے۔۔ میرا تخیل مدہوش ہوتا جا رہا ہے۔

روشنی، روشنی

روشنی کہاں ہے؟

کوئی روح آواز دے رہی ہے۔ انتظار کرو دائرہ خود روشنی دے گا اور ہم اور تم ایک ہو جائیں گے۔ تاریکی کا دائرہ روشنی کو اپنے میں سمیٹ لے گا۔ روشنی دائرے کو اپنی گود میں لے گی۔ پھر ہم اور تم، تم اور ہم یہ سوال باقی نہیں رہے گا...... ۔

نروان ہمیں بھی مل جائے گا۔ پیپل کا پیڑ پھر ہنسے گا اور برسہا برس ہماری پرستش ہوتی رہے گی۔

OOO

وقت کے احاطے میں

۳۱ دسمبر کی رات، کمرے کی تنہائی، ٹیبل پر رکھا لیمپ اور گذشتہ سال، یعنی آج تک کا کلنڈر، یہ سب کے سب مجموعی طور پر اپنے نقوش قائم کئے ہوئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کلنڈر جو اب تک ٹنگا ہوا تھا۔ نیچے گر چکا ہے اور اس کی ساری تاریخیں غائب ہو چکی ہیں۔ ہر تاریخ کے خانے میں کچھ تصویریں ہیں۔ جو ابھی مدھم مدھم ہیں۔ کسی دھند لکے میں ہیں۔ ہر ماہ کا صفحہ خالی ہی خالی ہے۔ آخر اتنی سرعت کے ساتھ یہ تاریخیں کہاں گئیں ابھی ابھی بارہ بجے سے قبل یہ سب تاریخیں موجود تھیں۔ کلنڈر ٹنگا ہوا تھا، اور ابھی بارہ بج کر کچھ سکنڈ ہی ہوئے تھے ابھی ابھی بارہ بجے سے قبل یہ سب تاریخیں موجود تھیں۔ کلنڈر ٹنگا ہوا

تھا' اور ابھی بارہ بج کر کچھ سکنڈ ہی ہوئے تھے کہ یہ سب بڑی سرعت کے ساتھ غائب ہو گئیں۔ میرے کمرے میں کوئی آیا بھی نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کوئی کیمیکل کا استعمال ان تاریخوں پر کیا تھا۔

آخر یہ کہاں گئیں ؟

کیوں کھو گئیں ؟ ؟

میں ابھی خوفزدہ اور کچھ متحیر ہو کر یہ سب غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک بہت سارے واقعات کی تصویریں یکے بعد دیگرے کلنڈر کے مختلف صفحوں اور صفحے کے خانوں میں بننے لگیں۔ سال گذشتہ' کتنے واقعات گڑھ کر چلا گیا۔ بے شمار انسانوں کی لاشیں' مختلف طبقات کے مسائل' اور ان مسائل سے ابھرنے والی کشمکش' یہ سب کچھ دھند لکے سے باہر آ رہا تھا۔ کہیں کوئی رامو چیخ رہا تھا۔ کہیں کوئی محمود آواز دے رہا تھا۔ زندگی مر مر کر جی رہی تھی۔ یا جینے کے لئے مر رہی تھیں اور سیاست کے اسٹیج پر مداری اپنا کرتب دکھا رہے تھے۔ کہانی بن رہی تھی' کہانی مٹ رہی تھی۔ ارمان جگ رہے تھے۔ ارمان کا خون ہو رہا تھا۔ کہیں دنگا اور فساد سے انسانیت کراہ رہی تھی۔ شانتی نگر آواز دے رہا تھا' وہ شانتی نگر جہاں ایک بابا نے انسانیت کی تعلیم دے کر ہندو مسلم کا دل جوڑنا چاہا تھا۔ وہاں سہاگ اجڑ رہا تھا۔ وہ شانتی نگر جہاں ایک بابا نے انسانیت کی تعلیم دے کر ہندو مسلم کا دل جوڑنا چاہا تھا۔ وہاں سہاگ اجڑ رہا تھا اور کسی مسیح وقت کا گھر مقتل کی جگہ استعمال ہو رہا تھا۔ دنگے کی آگ پھیلی' رہبران وقت باخبر ہوئے۔ بادشاہ نے معائنہ کیا۔ ان بولتی لاشوں نے خاموش

زبان سے سب کچھ کہہ دیا۔ مگر سچ میں کتنی تلخی ہوتی ہے۔ اس کو کون برداشت کر سکتا ہے۔ پھر حالات معمول پر آگئے ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ وقت کی نبض اپنے رفتار پر آگئی اور تاریخیں بدلتی رہیں۔ اکاسی 'بیاسی میں بدلا اور بیاسی 'تراسی میں بدل گیا۔ بیاسی نے اکاسی کا مقابلہ کیا۔ کیونکہ وہ اکاسی سے پیچھے رہنے والا نہیں تھا۔

اشانتی نگر کے فساد نے "شانتی نگر" کے فساد کا جواب دیا اور پھر سال کے اختتام پر دنیاوالوں نے جواہر لال اسٹیڈیم میں کھیل کود کر جشن منایا۔ بھوکے ننگے ملک کو دلہن بنا کر پیش کیا گیا۔ کیونکہ ازل سے تصنع ہماری قسمت ہے 'اور فی زمانہ تصنع کے مظاہرے کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔

بھیک مانگنے سے ایڈ لینے تک کا مسئلہ بھیس پر ہی منحصر ہے۔ بھیس بدل بدل کر بھیک مانگو تاکہ کوئی جانے نہیں کہ تم فقیر ہو۔ عمارت کی شان بھی قائم رہے اور فاقہ کا مسئلہ بھی حل ہوتا رہے۔ ہم جدید ہیں' قدیم لوگ جو بھول کر چکے وہ یقیناً ہم نہیں کریں گے۔ شانتی نگر نے ہمیشہ فاقہ کشوں کے لئے لوٹ مار کا سامان مہیا کیا ہے۔ اسی کی دین مہاتما گاندھی سیتو ہے۔

مہاتما گاندھی سیتو کتنی بدلی ہوئی تاریخوں کی یادگار ہے۔ کتنی تاریخوں کو کھودینے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ شہیدوں کا یادگار معصوموں کے خون کا تحفہ 'شانتی نگر کے نام تھا کہ اس نے اُتر اور دکھن کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ فرق مٹانے کی کوشش تو صدیوں سے ہو رہی ہے 'اور ہمیشہ سے پیغمبران وقت نے اس کوشش میں اپنی جانیں گنوائیں ہیں۔ مہاتما گاندھی

سیتو تعمیر میں اگر جانیں گئیں تو کیا ہوا۔ اتر' دکھن کا فرق مٹ گیا۔ کیا یہ انسانیت کی کامیابی نہیں ہے۔ مگر کون ہے جو اس کامیابی کو گلے لگائے۔ ہم نے تحفہ قبول کیا اور ریل پر لوٹ اور قتل کے لئے آسانیاں فراہم کر دیں۔ لٹیرے کل سے زیادہ مطمئن ہیں۔ ہم نئے شانتی نگر کا خواب دیکھ رہے ہیں اور لوگ اس خواب کی تعبیر بر عکس پیش کر رہے ہیں۔

تعبیریں تو بر عکس ہوا کرتی ہیں۔ خواب کون سا سچا ہوتا ہے۔ کون سا خواب سچا ہوا ہے ؟؟

مگر نہیں کچھ خواب سچّے بھی ہوتے ہیں۔

بادشاہ نے اپاہجوں کے لئے کتنی سہولتیں فراہم کر دی ہیں۔ کبھی انھوں نے آزاد ملک کا خواب دیکھا ہوگا اور اپنے لئے سہولتوں کا بھی قیاس کیا ہوگا۔ چلو ان کے خواب تو سچے ہوئے۔

مگر میں ابھی یہ سب لاشعوری طور پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک سڑک پر سردی سے کراہتے ہوئے ایک انسان کی آواز آئی۔

یہ ایک لنگڑا بھکاری تھا جو اپنے سونے کی جگہ فٹ پاتھ پر بنائے ہوئے تھا۔ آج کچھ دکانداروں نے میونسپلٹی والوں کو ملا کر فٹ پاتھ پر قبضہ کر لیا تھا اور اب اس بھکاری کے لئے سونے کی جگہ باقی نہ تھی۔ اب وہ کسی دائمی سونے کی جگہ کی تلاش میں آگے قدم بڑھا رہا تھا کہ اچانک سردی کے مارے بے ہوش ہو کر شاہراہ پر گر پڑا تھا' کراہ رہا تھا کہ شاید اس کی آواز اپاہجوں کے سال منانے والے کارکنوں کے کان میں پڑ جائے۔ مگر یہ آواز تو اس قدر نحیف ہو چکی تھی کہ خود اپنے آپ میں

کھوئی جارہی تھی۔ انسان کہاں کوئی تھا جو اس کو دیکھتا۔۔

کچھ کُتے بھونکے' رات اور بھی بھیانک ہو گئی۔ بوڑھے کی سانس اکھڑ چکی تھی اور وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ سونے کی دائمی جگہ اسے مل چکی تھی۔ کتے اسے دیکھ کر بھونک رہے تھے' شاید اس کے سکون پا جانے پر رشک کر رہے تھے۔

تاریخ بدلتی جاتی ہے۔ جلسے ہوتے ہیں۔ انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ کسی کو ویر گتی پراپت کرنے کا تمغہ دیا جا رہا ہے اور کسی کی ہمت افزائی کے لئے صرف خالی خولی الفاظ ادا کئے جا رہے ہیں۔

اسٹرائک ہو رہی ہے۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ پھر کچھ روٹی کے ٹکڑے دے کر نعرہ لگانے والوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کا فروغ اس میں ہے کہ شعبۂ حیات کے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ کارکن کو کچھ دے کر مطمئن کر دیا جائے' انہیں سلا دیا جائے کہ وہ باغی نہ بن جائیں اور حکومت کے عملے شب خون لگاتے رہیں۔ ٹیکس کاٹتے رہیں۔ چیزوں کی قیمت دوگنی اور تین گنی ہوتی رہے۔ سیٹھ ساہوکار خوش ہوں اور سماج کا ناسور پلتا رہے۔

تاریخ پھر بدل گئی ہے۔ میرے بھائی!

آج پھر ایک نیا سورج ہمیں آسمان سے جھانکتا دکھائی دے گا اور اس کے سات رنگوں میں ہم آج سے شروع ہونے والے پورے سال کا تصور کریں گے کہ سال' رنگوں سے بھرا ہو' اجالوں سے بھرا ہو ان خوابوں سے بھرا ہو' جنہیں ہم ہر سال کی پہلی صبح' سورج کی کرنوں سے بنتے ہیں۔

بُنے ہوئے خواب آج بھی ہماری مٹھیوں میں' گذشتہ سال کی پہلی

کرن کی طرح موجود ہیں جنہیں ہم تھکاوٹ کے ان لمحوں میں دیکھ لیتے ہیں۔
جب ہمیں لگتا ہے کہ زندگی تھوڑی دیر کے لئے ہم سے دور چلی گئی ہے۔
آج جو نیا ہے کل وہ پرانا ہو جائے گا۔ جس میں ہم ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ ہماری زندگی دوڑ رہی ہے نئے سال کی پہلی روشنی کی طرف۔ زندگی آگے، ہم پیچھے۔

مانجھی وہی
منجدھار وہی
نیا وہی
پتوار وہی
آکاش سے پاتال تک کا منظر وہی!

زندگی کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں۔ کیا کہیں ہم زندگی کو۔
بھیڑ چلی جا رہی ہے۔ تیز دھوپ میں، بارش میں۔ ہم بھیڑ کی روک کیوں نہیں دیتے۔ مچھلیوں کو ندیوں کے خلاف کیوں نہیں ورغلاتے۔ آدھی رات تک بچے جاگ رہے ہیں۔ زی۔ ٹی۔ وی، ایم ٹی وی، اسٹار ٹی وی اور نہ جانے کون کون ننگا پن پروس رہے ہیں ان کے پاس عوام کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے جیسے اور کچھ نہ ہو، کوئی مسائل باقی نہ رہ گئے ہوں۔ حل ہو گیا ہے جیسے سارا مسئلہ۔ کہتے ہیں جب کوئی چیز جرجر ہو جائے تو موت اس کے لئے وردان ہوتی ہے۔
"پرانی حویلیوں" کو گرنے دو۔ اس کی مرمت مت کرو۔ تبھی ایک "نئی عمارت" کھڑی ہو سکتی ہے کہ زندگی کو اپنے کاروبار سے فرصت

نہیں ہے کیا کہیں ہم زندگی کو۔

پورب، پچھم، اُتر اور دکھن کی طرف
کھلنے والی تمام کھڑکیوں سے
بس ایک ہی منظر
بنجر اور سنگلاخ سرزمین
بانجھ دھرتی
تالابوں میں بنتے، مٹتے دائرے
تڑپتی، اچھلتی، مچھلیاں
اور ان سب کے بیچ کراہتی ہوئی بوڑھی تاریخ
جنم دے رہی تھی ایک نئے خورشید کو
جس کی کرنوں سے
گلاب کا پھول
کمہلا کمہلا کر گر رہا تھا
نئی تاریخ بن رہی تھی
خورشید کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا۔

تاریخ پھر بدل گئی ہے میرے بھائی! تاریخ بدلتی ہی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کیا پھر اس تاریخ کا سرکولر موشن ہمیں ماضی کی خوش حالیوں، اطمینان اور سکون کی جانب لے جائے گا۔

وقت کس گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے۔ اس کی رفتار کیسی ہے

کل صبح پھر سے کلنڈر آباد ہوں گے۔ تاریخیں نیا جنم لیں گی۔

فن کار انہیں دیکھتا ہے وقت کے دھارے کو گرفت میں لینے کے لئے اپنی انگلیاں خون دل میں ڈبو لیتا ہے تاریخ بدل جاتی ہے۔ نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ایک ہنگامے کے ساتھ اور پھر تاریخیں سرعت کے ساتھ بدلنے لگتی ہیں فنکار کا قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ وہ کیا پیش کرے، ماضی یا حال؟

حال اپنی زبان سے سچ کہہ رہا ہوتا ہے۔ ماضی تو افسانہ بن چکا ہے۔ سچ کہے یا افسانہ پیش کرے۔ اس کشمکش میں فنکار کا قلم اس کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے، اور جب صبح ہوتی ہے تو نئے سال کا کلنڈر اسے نئی تاریخوں کے ساتھ جگا دیتا ہے۔ اس وقت فنکار کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فن کتنا جھوٹا ہے۔ تاریخیں کتنی سچی ہیں۔ ان کے عدم میں بھی ان کا وجود ہے اور فنکار کا وجود بھی اس کے عدم کی نشاندہی کرتا ہے۔

کمرے کی روشنی تیز ہوتی ہے۔ باہر سے آواز آتی ہے "نیا سال مبارک ہو"!

()()()

خبر ہونے تک

میں نے جب کبھی حقیقت کا سامنا کرنا چاہا ہے تو خود کو اپاہج محسوس کیا ہے۔

انسان کتنا بے بس ہے وقت کے ہاتھوں کا کھلونا مجبور! اس پر یہ تیور کے میں انقلاب لا سکتا ہوں۔ زندگی تیز رفتاری سے اپنی مسافت طے کرتی ہے اور انسان خواب اور حقیقت کے دوراہے سے گزرتا رہتا ہے۔ کبھی اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر خواب ایک حقیقت ہے اور کبھی لگتا ہے کہ ہر حقیقت ایک خواب ہے۔ یہ گتھی بھی عجیب ہے۔

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ابھی میں اپنی اس فریب خردگی پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک میری

نظروں کے سامنے سے کئی تصویریں گزر گئیں۔

ایک انسان کے دو ہاتھ غائب تھے

ایک انسان کوڑھی تھا۔ بالکل گلا ہوا۔ چلنے پھرنے سے مجبور۔

ایک انسان کی ٹانگیں نہیں تھیں اور وہ ٹرالی چلانے والے کے ذریعہ لے جایا جا رہا تھا

ایک کا چہرہ مسخ تھا

اور ایک کی آنکھیں نہیں تھیں......

......

......

یہ اپاہجوں کی ٹولی بس ایک سمت میں رواں تھی اور میری آنکھیں ان کا محاصرہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ دماغ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب قدرت کے خواب کی تعبیریں ہیں۔

خواب جھوٹا، تعبیریں حقیقی!

قدرت کہانی گڑھ رہی تھی۔ فطرت کہانی سن رہی تھی۔ انسان اس کی کہانی میں مختلف رول ادا کر رہا تھا کبھی بیمار اور کبھی مسیحا۔ خود ہی درد بھی ہے، خود ہی درد کا مداوا بھی۔

خوف اور سراسیمگی کی فضا چھاتی جا رہی تھی۔ تاریکیاں بڑھ رہی تھیں۔ مگر انسان کی کاوشیں بھی اپنی جگہ قائم تھیں پنڈال پر لکھا ہوا "اپاہجوں کا بین الاقوامی سال" بین الاقوامی سطح پر اپاہجوں کے مسائل کا حل پیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسی دم بیک وقت کئی آوازیں کانوں کو سنائی

دینے لگیں۔

مجھے ہاتھ دو۔۔۔۔

میرا کوڑھ دور کرو۔۔۔۔

میرا چہرہ مجھے واپس لادو۔۔۔

مجھ کو آنکھیں دو۔۔۔۔

آواز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ پورا پنڈال گونج رہا تھا' اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ ذہن میں کوئی حل نہیں باقی رہ گیا تھا۔ عالم بے چارگی میں۔ میں نے مائک پر آکر اعلان کیا ہماری سرکار نے اپاہجوں کے لئے کمبل کا انتظام کیا ہے

ابھی میرا اعلان مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور چیخ چیخ کر گانے اور ناچنے لگا۔ یہ پاگل تھا اور اسے دماغ کی ضرورت تھی ۔ میں وہ دماغ اسے کہاں سے دیتا۔ جس دماغ سے وہ سردی اور گری کا احساس کرپاتا۔ اس کے لئے کمبل لایعنی تھے۔

اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ انسان' انسان کہاں رہ گیا ہے۔ وہ تو اپاہج ہو چکا ہے۔ اس کے ہاتھ ٹوٹ چکے ہیں اس کی ٹانگیں کٹی ہوئی ہیں۔ اس کا چہرہ مسخ ہے۔ آنکھیں بے نور ہیں اور دماغ ...... دماغ مفلوج ...... احساس سے پرے ...... خیالات سے ماورا!

OOO

کشکول

ٹیبل پر قلم ہاتھ میں دبائے بیٹھا ہوا افسانہ نگار خیالات کے افق میں کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا۔ اس کے ارد گرد کتابوں' رسالوں اور کاغذوں کے انبار اس سے چشمک کر رہے تھے۔

اس نے بہت لکھا ہے۔ اپنا خون جلا کر' اپنی خوشیوں کی قربانی دے کر۔ وہ انسانیت کا علمبردار ہے۔ وہ سسکتی بلکتی انسانیت کو عروج بخشنا چاہتا ہے۔

وہ لکھتا ہے اس لئے نہیں کہ داد تحسین حاصل کرے۔ مگر کھو کھلی داد اس کی قسمت بن چکی ہے۔ تعریفی و توصیفی جملے اس کے نفس کو موٹا کر چکے ہیں۔ مگر وہ لکھتا ہے تاکہ انسانیت خود اپنا گلا نہ گھونٹ لے۔ وہ

لکھتا ہے ' تاکہ فسادات بند ہوں ' عالمی جنگ کی تاریخ دہرائی نہ جائے۔ بھوکوں کو روٹی مل سکے۔ ننگے کپڑے حاصل کر سکیں اور ایٹمی دھماکے کا کوئی خطرہ نہ رہے۔ اس کا ایک ایک جملہ معنی خیز ہے۔ مگر وہ تو محض افسانہ نگار ہے۔ تھیوری دے سکتا ہے۔ اس کی تھیوری پر پریکٹیکل تو دنیا کے دارالتجربے میں ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ کبھی کامیاب اور کبھی ناکام!

مگر احساس ناکامی نے آج نہ جانے کون سی کیفیت پیدا کر دی کہ افسانہ نگار اپنے سامنے رکھی ہوئی اپنی کتابوں کے انبار سے اپنا تجزیہ سن رہا ہے۔

تم کیوں لکھتے ہو؟

زندگی کیا ہے؟؟

فیک...... سب فیک...... کائنات فیک ہے۔ تم فیک ہو۔ وہ جو فیک ہے اس کی تزئین کے درپے کیوں ہو؟

جنگیں ہوں گی۔ انسانیت کچلی جائیں گی۔ نا مساوات کی فضا قائم رہے گی۔ تمہارے قلم کی سیاہی برباد ہو گی۔ مگر تم عادت سے مجبور ہو۔ لکھ لکھ کر مجھ جیسی نامراد کتابوں میں اضافہ ہی کرتے جاؤ گے۔

کرتے جاؤ پٹھے!

میں بڑھ رہا ہوں۔ میری جماعت بڑھ رہی ہے۔ ڈیموکریسی جو فیک ہے۔ شاید کل میری تعداد سے حقیقت بن سکے۔

اجالے ڈھونڈھنے کے لئے اندھیرے میں غوطہ لگاؤ۔ کبھی ٹھوکر لگے گی۔ کبھی اپنا وجود بھی نظر نہ آئے گا۔ مگر تم اپنے خون دل سے چراغ

جلاتے جاؤ۔ یہی اندھیرے کو روشنی دیں گے۔

مگر روشنی کہاں!

اندھیرا ہی تو سب کچھ ہے۔ روشنی کا مسکن اندھیرا اور اندھیرے کی گود میں روشنی۔ وجود روشنی کا بھی اندھیرے سے الگ نہیں۔ یہ ایک المیہ ہے۔ جس پر تم یا ہم کوئی قدرت حاصل نہیں کر سکتے۔

اے افسانہ نگار! تم نے مراد آباد کے فرقہ وارانہ فساد پر افسانے لکھے۔ اس موضوع پر لمبی لمبی تقریریں کیں۔ تم نے آل انڈیا کانفرنس میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بہت ہی موثر تقریریں کیں۔ خوب تالیاں بجیں۔ دو لاکھ روپے کا خرچ۔ مرغا۔ ٹانگ۔ شراب۔ اور آسمان کو چھوتی ہوئی عمارت۔

ذہن تمہاری کہانیوں سے مسخ ہو رہا ہے۔

کہاں۔ کون۔ کیا۔ کیسے ؟؟؟

یہ سوالات ابھر رہے ہیں۔ قاری بے بس ہیں۔ بڑی امیدیں لے کر تمہارے افسانوں کی آوازیں سنتا ہے۔ چاہتا ہے کچھ اخذ کرے مگر کیسے۔

ذہن تو مسخ ہو چکا ہے۔ تمہاری آوازیں کھوکھلی ہیں۔ تمہارا درس حیات لایقینی ثابت ہو چکا ہے۔

ضمیر کی کشمکش۔ اقدار حیات کے بدل جانے کی حالت۔ استحصال کی صورت۔ ہر چہرہ مشکوک۔ مراد آباد کے فساد پر اظہار افسوس۔ ایک عمومی رویہ۔ اپاہجوں کا بین الاقوامی سال۔ کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں۔ سرکار کے عملی اقدام کا پروپگنڈہ۔ ایک دھوکا۔ ایک فریب۔ سمینار۔

جلوس۔ آل انڈیا کانفرنس۔ مشاعرہ۔ ہنگامے اور تقریریں۔!!
بند کرو بجواس کو ہمارے کان سن رہے ہیں۔ دماغ مفلوج ہو رہا ہے۔
میں جو سوچ رہا ہوں وہ میرے احاطہ فکر میں نہیں آ رہا ہے۔

ایٹمک انرجی کا سوال۔ شک۔ دھوکا۔ ہنگامہ خیز انقلاب۔ تمہارا درس حیات اب تم سے سوالی ہے۔

بھر دو اس کی کشکول۔ فقیر چلا جائے گا اور تمہاری بازگشت فضا میں گونجتی رہے گی۔

OOO

انگلیوں کا رقص اور آنکھیں

میں کرسی پر بیٹھا تھا اور میری انگلیاں ٹیبل پر رکھے سرخ کاغذ پر رقص کر رہی تھیں۔ میرے کمرے میں میرے علاوہ دو آنکھیں اور تھیں، جو میری انگلیوں کے رقص کا محاسبہ کر رہی تھیں۔ میری انگلیوں کا رقص جاری تھا اور میرا ذہن بس ایک نقطہ پر مرکوز تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی، اور پھر انگلیوں کا رقص ختم ہو گیا۔ میرے قدم دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو سامنے دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

کیا چاہتی ہیں یہ آنکھیں؟

شاید میری آنکھ کے RETINA پر کچھ تصویریں تلاش کر رہی

ہیں۔اچانک کمرے کا سبز بلب جلنے اور بجھنے لگا۔ سبز بلب کے جلنے اور بجھنے کا سلسلہ جاری تھااور دروازے کے پاس دو آنکھوں کا۔

میں کمرے کی چہار دیواری سے باہر کھنچتا چلا گیا۔نا معلوم کون سی کشش تھی ان دو آنکھوں میں۔میں کھنچتا چلا گیا۔

اب میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوں اور میری انگلیوں کا رقص اب سبز گھاسوں پر شروع ہو جاتا ہے کہ پھر وہی دو آنکھیں سبز گھانسوں کے درمیان سے جھانکنے لگتی ہیں۔

پیپل کے درخت سے کچھ ہی فاصلے پر ''الحیات'' کے کمرے میں سبز بلب اب بھی جل بجھ رہا تھا اور ادھر گھانسوں کے درمیان سے دو آنکھیں مجھے بدستور گھورے جارہی تھیں۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ گھانسوں کے درمیان آنکھیں۔

بچپن میں بھوت پریت کے قصے بہت سنے تھے۔وہ سب اب سچ نظر آرہے تھے۔

آواز آئی۔

تم مجھے پہچانو۔ہاہا......ہاہا...... نہیں پہچان سکے نا......؟

میں گھبر اگیااور دو آنکھوں کو اپنی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا چاہا۔ مگر کہیں کچھ نظر نہیں آیا۔البتہ پیپل کے پیڑ کے پتے جو جھوم رہے تھے اب ساکت ہو گئے اور کمرے کا سبز بلب۔؟

پھر آواز آئی۔

تم مجھے نہیں جانتے۔ مگر میں تم کو جانتی ہوں۔ آج میں تم سے

باتیں کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تو میرا ہی کلیجہ ہے کہ میرے کھیت کی فصل مولی گاجر کی طرح کٹتی رہی، سرخ ندی بہتی رہی، معصوم پرندوں پر ظلم ہوتے رہے تاریخی مینار سے پرندوں کی لاشیں گرتی رہیں۔ لیکن میں گھوم گھوم کر خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہی۔

میں کبھی سوچتی ہوں کہ گھومنا بند کر دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ چکر لگانا میری فطرت میں داخل ہے۔ گھومنا میری قسمت ہے اور آئے دن ہونے والے تماشے دیکھنا میرا مقدر بن چکا ہے۔

نا جانے کتنی اولادیں ہیں میری مگر ان میں سے صرف تین ہی کام کی ہیں دو تو اس دنیا کے سب سے بڑے طاقتور کہلاتے ہیں۔ مگر میری بڑی اولاد کی یہ بد نصیبی ہے کہ اس کے پاس دولت کا انبار ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا استعمال کرنا نہیں جانتا اس کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ ان دونوں سے بھی زیادہ باصلاحیت ہے۔ مگر کاش کہ کوئی اسے احساس دلاتا۔

یہ میری ہمت ہی تھی کہ میرے نواسوں کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے گئے اور میں خاموش بیٹھی رہی۔ مگر کبھی کبھی مجھے غصہ بھی آجاتا ہے اور وہ طوفان اٹھتا ہے کہ ...... معاذ اللہ۔ میرا غصہ بہت خراب ہے۔ ویسے مجھے غصہ تو کبھی کبھی آتا ہے۔

یہ آنکھوں کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کے Retina پر دنیا کی بے شمار تصاویر بنتی ہیں مگر خود اس کی......

میرا مطلب تم سمجھ گئے ہو گے

کاش! کوئی آئینہ رکھ دیتا تو وہ اپنی تصویر بھی دیکھ سکتیں۔

کیا تم ایسا کرو گے ؟

لیکن تم ایسا کیوں کرنے لگے۔ تم تو افسانہ نگار ہو۔ روٹی کے چکر اور حصارِ ذات سے تمہیں فرصت ملے تب تو فسوں سازی میں تم تو ماہر ہو۔ مگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن نہیں، تم کو یہ کرنا ہو گا۔ تم جادوگر ہو نا، جادو کے زور پر تم باطن کی تصویر بھی اتار سکتے ہو۔ وہ تصویریں بھی بالکل صاف کر سکتے ہو۔ جو دھندلی اور پانی سے مٹ گئی ہیں۔

ہاں، تم کو یہ کرنا ہو گا!

بولو، کرو گے نا، خاموش کیوں ہو ؟

تمہاری خاموشی میرے تخیّل کا امتحان لے رہی ہے۔ جلدی سے ہاں یا نہیں کہو۔

مگر، نہیں! حتمی فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو۔ اس کے لئے جگر چاہئے، دل چاہئے۔ وہ تو اب تم کھو چکے ہو۔ صرف دماغ سے کام لے رہے ہو۔

دماغ

جلتا بجھتا بلب

دھواں دھواں سا تخیّل

آنکھوں کو کچھ سوجھتا ہی نہیں

......

پیپل جھومتا ہے اور میری انگلیاں لہولہان ہیں۔

OOO

کرچیاں اور فریم

رات تاریک اور طوفانی ہے۔ کُتے بھونک رہے ہیں۔ ہوا تیز ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن آنگن میں کھڑا برگد کا پیڑ خاموش ہے۔ ادھر میں کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے دیوار کے وسطی حصہ پر ٹنگے فریم میں لگی تصویر مسکرا رہی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹیبل پر جلتی ہوئی موم بتی تاریکی کو دور بھگانے کی ناکام کوشش میں لگی ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوتا ہے جلتی ہوئی موم بتی ایک ہچکی کے ساتھ دم توڑ دیتی ہے۔

طوفان کب تھمے گا؟

سویرا کب ہوگا؟؟

آندھی۔ طوفان۔ فریم۔روشنی۔ تاریکی

بجلی جو کئی گھنٹوں سے غائب تھی۔ بغیر دستک دیئے آگئی۔ اب کمرہ روشن تھا۔ ساری چیزیں نظر آرہی تھیں۔ ہوا کا تیز جھونکا ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سامنے کی دیوار پر ٹنگا فریم جھولنے لگتا ہے۔ ٹھیک پنڈولم کی طرح فریم بیچ کے نقطہ کو اسپرش کرتا ہوا پہلے دائیں جانب جاتا ہے اور تب بائیں جانب۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ مجھے فریم کا اس طرح جھولنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ فریم ایک جگہ ساکت رہے۔

میں کرسی سے اٹھ کر فریم کے قریب جاتا ہوں اور اپنے دائیں ہاتھ سے فریم کے بیچ والے نقطہ کے پاس ساکت کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ فریم کو دائیں جانب والی طاقت اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔بائیں جانب والا' دائیں جانب والے سے زیادہ طاقت لگا کر اپنی طرف کھینچتا ہے اور ادھر میں بت بنا بیٹھا دونوں کے درمیان چل رہی اس رسہ کشی کو دیکھ رہا تھا۔ فریم میں لگی تصویر سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کھینچا تانی میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر کبھی بائیں جانب سے مدد مانگتی ہے اور کبھی دائیں جانب والے سے۔ مگر یہ دونوں اپنے کو ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ثابت کرنے میں لگے رہے۔

فریم زور زور سے جھول رہا ہے۔ پنڈولم کی طرح۔ فریم میں مقید تصویر یہ چاہ رہی ہے کہ وہ ایک جگہ بیچ والے نقطہ کے پاس ساکت رہے۔ لیکن ابھی جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ فریم اب کبھی ایک

جگہ ساکت نہ رہ پائے گا۔

کھربوں روپے کا خرچ

جنگ

دائرہ

جھولتا ہوا فریم

فریم اب بھی جھول رہا ہے۔ لیکن پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔
کمرے میں تیز ہوا بھی داخل ہوتی تو وہ فریم سے ٹکرا کر ناکام واپس لوٹ جاتی تھی مگر اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ ماضی کی باتوں کو غلط ثابت کر رہا تھا

آخر ایسا کیوں ہوا؟

فریم کے جھولنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔

ایک

دو

تین

چار

......

......

......

انیس

......

ایک مرتبہ اور بس ایک مرتبہ اور

لیکن یہ کیا؟

فریم بائیں جانب ترچھی حالت میں ساکت ہو گیا

مجھے فریم کا جھولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن جب فریم کے جھولنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور میری کوششوں کے باوجود فریم متحیر ہی رہا تو میں نے جھولتے فریم سے مصالحت کرلی اور تب میں اس سراغ میں لگ گیا کہ اس کا ٹائم پریڈ معلوم کیا جائے اور جب میں اس سراغ میں لگا تو۔ تو کیا ہوا؟۔

ہو گا کیا؟ ہُوا یہ کہ فریم انیس مرتبہ جھول کر بائیں جانب ترچھی حالت میں ساکت ہو گیا۔

اب اس کا ٹائم پریڈ کیسے معلوم ہو گا۔

میں فریم کے قریب جاتا ہوں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے جھلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ فریم کو بائیں جانب والی طاقت پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جو یقیناً میرے دونوں ہاتھوں کی قوت سے کئی گنا زیادہ تھی۔

میں شاہراہ کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب جاتا ہوں اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہوں۔ مگر میری آواز واپس لوٹ کر آجاتی ہے۔

فریم اب بھی اسی دیوار کی بائیں جانب چپکا ہوا ہے۔ تو کیا دائیں جانب والی طاقت کی شکست ہو گئی؟

میرے اندر ایک عجیب قسم کی بے چینی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے اور کمرے کے چاروں طرف چکر لگانے لگتا ہوں۔

ایک...... تین...... سو...... دو سو......

نقطہ ایک مگر دائرے ان گنت!

میں کیوں چکّر لگا رہا ہوں۔ میں کس کے اشارے پر دائروں کی تشکیل کر رہا ہوں۔ کیا دائرہ بنانا میری فطرت میں شامل ہے۔ دائروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ میں چکر لگاتا رہا۔ دائرے بنتے رہے۔ دائرہ کے اندر دائرہ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد دائرہ دھیرے دھیرے تنگ ہونے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ دائروں کے حصار میں میرا وجود......

دائرہ تنگ ہوتے ہوتے نقطہ کی شکل اختیار کر گیا اور میری آنکھیں......

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں......

کئی گھنٹوں کے بعد مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا کہ میرے پاؤں اب میرے نہیں رہے ہیں اور میرے ہاتھ ...... میرے جسم میں دوسرے کے ہاتھ اور پاؤں فٹ کر دیئے گئے ہیں۔

میری نظر فریم کے پاس جا ٹکتی ہے اور تب مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایں ٗمر گیا اور میری امیدیں بائیں جانب چپک گئیں تو کیا فریم اب کبھی اپنی اصلی حالت پر نہیں لوٹ سکے گا۔

نہیں! نہیں!!

ایسا نہیں ہو سکتا۔ سیکڑوں ہاتھ مل کر فریم کو آزاد کرائیں گے۔ کروڑوں پاؤں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں گے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آسمان میں زوروں کی بجلی چمکی۔ ہوا تیز

چلنے لگی جو بعد میں طوفان کی شکل اختیار کر گئی انسان اور جاندار سب اکھڑنے لگے۔

باہر شدید آندھی اور طوفان کی وجہ سے سارے جانور ایک وسیع میدان میں جمع تھے۔

اب میں بھی محفوظ نہیں رہ پاؤں گا۔ آندھی اور طوفان میں اس کچے مکان کی کیا حیثیت۔ پورا مکان منہدم ہو جائے گا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ آخر میں کروں تو کیا کروں۔ سارے حل مسلوب ہو چکے ہیں میرے ارد گرد غبار ہی غبار ہے۔

باہر آندھی تیز ہوتی جارہی تھی‘‘اور بستی کی بستی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر پورا مکان ڈول رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شاہراہ کی طرف کھلنے والا دروازہ زمین سے آلگتا ہے۔ کمرے میں رکھی ساری چیزیں ادھر سے ادھر بکھرنے لگتی ہیں۔

چھناک......!

کوئی روشنی دکھائے!!

فریم آندھی اور طوفان سے مقابلہ کرتے کرتے کئی خانوں میں بکھر جاتا ہے اور اس کی کرچیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتی ہیں۔

OOO

انسانیت کے دشمن

شام کا دھندلکا رات کے گہرے دبیز اندھیرے میں گُم ہو گیا۔ نیلگوں فلک پر ننھے ننھے ستارے مسکرا اٹھے۔ افق کی مغربی سمت بادلوں کے بے ترتیب ٹکڑے پھیلنے لگے۔ اچانک ایک بہت بڑا جلوس آتا دکھائی دیا اور پھر آگ کے شعلے ہوا میں بھڑک اٹھے۔ چاروں طرف بندوق کی گولیوں اور بموں کی آواز گونجنے لگی۔ جس کے بیچ کبھی کبھی کوئی چیخ سنائی دے دیتی۔ ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کُتّے بھونک رہے تھے۔ نعرے بدستور لگائے جا رہے تھے۔ محلّے میں لوگ دوڑنے لگے۔ عورتوں اور بچوں کا شور' مردوں کے نعرے' کتوں کا بھونکنا۔ یہ سب مل کر کتنا وحشت انگیز ہو گیا تھا۔ شانتی اور سکون کا کہیں نام و نشان نہیں۔ بے چینی' اضطراب' ہلچل'

ہنگامہ، مختلف نعرے فضا میں گونج رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔

گاندھی اور نانک کی زمین پر کنول کے پھول کھل رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں، آمریت / جمہوریت / اشتراکیت / سماج واد / مارکس واد / لینن واد / ماؤ واد / گاندھی واد، سارے خواب بکھر چکے ہیں۔ لوگ سراسیمگی کے عالم میں پریشان جانے کیا کیا کہہ رہے تھے، کر رہے تھے اور وہ، ہاں وہ بیٹھا اپنے بابا کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بابا ابھی تک آفس سے لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں انسانیت کے دشمنوں نے اس کے بابا کو مار تو نہیں دیا۔ طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں اس کے ننھے سے ذہن میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ اچانک اس کو سامنے سے بابا آتے دکھائی دیئے۔ وہ خوش ہو اٹھا اور دوڑ کر گھر کے اندر گیا۔

ماں! ماں!! بابا آگئے۔ ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی اس کی ماں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اس نے آنے کی خبر سنی تو دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔ لیکن یہ کیا؟ باہر تو منظر کچھ اور ہی تھا۔ اس کے شوہر کو دس پندرہ آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند آدمیوں کے پاس بندوقیں تھیں / ترشول تھے اور باقی لاٹھی لئے تھے۔ کسی نے انہیں ننگا کر دیا، اور پھر ترشول ان کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

ماں! ماں!! دیکھا ان ظالموں نے میرے بابا کو کتنی بے رحمی سے مار ڈالا۔ میرے بابا نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا نہ جانے آج کتنے بابا اپنے معصوم بیٹوں سے جدا ہو گئے ہوں گے۔ وہ رو رو کر اپنی ماں سے کہے جا رہا

تھا۔ماں ‘تم بولتی کیوں نہیں ؟ تم خاموش کیوں ہو ماں ‘ مجھے بھی ایک بندوق دو ‘میں ابھی بابا کے قاتلوں سے بدلہ لے کر آتا ہوں۔

وہ گھوم کر اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ کیا؟اس کی ماں اس دنیا سے گزر چکی تھیں کہ انجانی سی گولی اپنا کام کر گئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگا۔ وہ لپٹ کر روتا رہا۔ یہاں تک کے چاند کی چاندنی پھیکی ہو گئی ستارے ماند پڑ گئے۔ رات نے اپنا کالا آنچل سمیٹ لیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ کرفیو کی وجہ سے پورے شہر میں خاموشی کا راج تھا۔

پڑوس میں رہنے والا لڑکا اس کے قریب آیا اور ہاتھ پکڑ کر رونے لگا۔ کیابات ہے راکیش تم کیوں رو رہے ہو کیابتاؤں رحیم ‘ میرے ماتا پتا دونوں کو ان پاپیوں نے زندہ جلادیا۔ اور...... اور ادھر میرے بابا کو تیرے دھرم والوں نے مار ڈالا۔ میری ماں بھی اس دنیا سے چل بسی۔

کوئی سالا ‘ اپنے دھرم پر نہیں چلتا ہے ‘اور دھرم کے نام پر فساد برپا کرتا ہے......

رحیم میرے بھائی ‘ابھی کوئی ہندو نہیں ‘کوئی مسلمان نہیں ‘ سبھی انسانیت کے دشمن ہیں۔ چلو ہم دونوں اس شہر ر جنگل سے دور چلیں۔ غموں سے لدے ہوئے دونوں راکیش اور رحیم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے معصوم ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ مگر وہ اپنے سوالوں کا جواب کس سے پوچھیں کس سے مانگیں ؟

خاموش ہو چکا ہے سارا شہر
مُردہ ہو چکی ہے روح
دوڑ رہی ہے جیپ' سارے شہر میں
جلتے بجھتے لال بلب والی
اور جاگتے شہر کو نیند آچکی ہے
دوڑتی ہوئی جیپ کو دیکھ کر بھاگ رہے ہیں' چاٹ بیچنے والے۔
دھرا رہ گیا ہے۔۔ آلو چاپ 'گپ چپ' ہانڈی میں املی پانی' دہی' مرچ مسالہ۔ ہوٹل میں بجھ چکے ہیں چولہیں.........

سارے علاقے میں پولس گشت لگا رہی تھی۔ نعرے لگانے والے اب خاموش تھے۔ پولس کا رعب اتنا زبردست تھا کہ سارا شہر خاموش ہو گیا تھا۔ کیا مجال جو کوئی آواز نکالے۔ سڑک سنسان تھی۔ کُتّے بھونک رہے تھے۔ لیکن قانون کے محافظوں کی گولی کی زد میں آکر وہ دونوں بھی وہیں ڈھیر ہو گئے' جہاں کبھی انسانیت کی فصل لہلہاتی تھی۔

OOO

افسانے خراد مشین پر

احمد یوسف

خورشید حیات افسانہ نگاروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو جدیدیت کا طوفان تھمنے کے بعد ہمارے سامنے آیا تھا۔

یہ وہ لوگ تھے جو نہ تو ادب میں صرف خاک و خون میں لتھڑی ہوئی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے ' اور نہ وہ تھے جو زندگی کی بے معنویت کے قائل تھے۔

ان لوگوں کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت تھی اور دو زمانے اور دو نسلوں کے ان کے پاس تجربے تھے۔ یوں کہنے کو ان لوگوں کے پاس بہت کچھ تھا جو ۱۹۴۷ عیسوی کے بعد آئے تھے اور ان کے پاس بھی تھا جو ترقی پسندی کے انتشار کے بعد جدیدیت کا ایک نیا رجحان لے کر آئے تھے۔

اس وقت میرے سامنے خورشید حیات کے پندرہ افسانے ہیں۔ ایڈز ' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے ' اور یوں انھوں نے اس مجموعے کا نام بھی 'ایڈز' ہی رکھا ہے

افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے تو اسے یہ علم ہوتا ہے کہ مال و زر کی ہوس نے جسے کلام حیدری GOLD RUSH کہتے ہیں' اس کائنات کو ایک عبرت گاہ بنا دیا ہے۔ دولت کی فراوانی انسان کو حرص و ہوس کے بازار تک لے جاتی ہے ' اور تب ایک دن

جنسی بے اعتدالی اسے قعر مذلّت میں ڈھکیل دیتی ہے ۔ ایڈز ' بالآخر ایک غیبی تازیانہ ثابت ہوتا ہے ۔ خورشید حیات نے اس مرض کی قہر سامانیوں کو کمال حسن و خوبی سے پیش کیا ہے ۔

آج کے دکھوں کو اور نئے ہندستان کے جملہ مسائل پر خورشید حیات نے اپنے طور پر غور و خوض کیا ہے ۔

ان کے دو ایک افسانے میں نجات د ہندہ بھی آجاتا ہے (طوفان سے پہلے طوفان کے بعد اور نروان) جو ہدایت دیتا ہے کہ آگے بڑھتے رہو ۔ " آگے کا راستہ کھلا ہے بند نہیں ہے "

فنکار سوچتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو جانے پر بھی قلم کی نب صحیح و سالم ہے ' اور اگر یہ سلامت ہے تو وہ از سر نو قلم کا سفر کر سکتا ہے ؟ اور ایک بار پھر اپنی آئیڈیا لوجی کی تعمیر کر سکتا ہے (لفظوں کی موت)

" چلتی رکتی گاڑی کے بیچ " میں وہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے پر سوچتا ہے کہ یہ مسئلہ در اصل ایسا ہے کہ اس کے سبب قومی زندگی رُک رُک سی جاتی ہے ۔

ماضی کے متعلق افسانہ نگار کا خیال ہے کہ ماضی ہمیں علم و آگہی سے روشناس کراتا ہے ' اور یہی وجہ ہے کہ جب انسان کا ماضی سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ' وہ اکھرا سا نظر آنے لگتا ہے (بابا) جیسا کہ میں نے پچھلی سطروں میں لکھا ہے کہ خورشید حیات نے ان افسانوں میں جا بجا بیش بہا انسانی زندگی کے تجربوں کو سمونے کی کوشش کی ہے ۔

آج کا انسان روز و شب کے دائرے میں قید ہے۔ آفس۔ کم تنخواہ اور بے شمار ضرورتیں / وہ سوچتا ہے کہ کس طرح اس دائرے کو توڑ کر آزاد ہو جائے، لیکن اس کی کوئی صورت نہیں نکلتی (دائروں کا قیدی) آگ جو تہذیب کا مظہر ہے، ہر آن اپنا مزاج بدلتی رہتی ہے، حتٰی کہ کبھی کبھی تو وہ سب کچھ جلا کر ہمارے آگے فقط خاک کا ڈھیر چھوڑ جاتی ہے (آگ لگنے کے بعد)۔

یہ دو ہاتھ اگر کسان اور مزدور کے ہوئے تو وہ فصل اگاتے ہیں؟ اور ہما شما کے لئے کپڑے بنتے ہیں، اور قاتل کے ہوئے تو عظیم سے عظیم انسان کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں (سوالیہ نشان کے نیچے کا نقطہ)۔

سال کے بدلنے پر انسان سوچتا ہے کہ کیا سچ مچ سال بدل گیا، کیا واقعی زندگی بدل گئی (وقت کے احاطے میں)۔

اپاہجوں کا سال منانے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انہیں سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، لیکن کیا وہ کسی پاگل کو دماغ فراہم کر سکتے ہیں (خبر ہونے تک)۔

"کرچیاں اور فریم" میں فریم در اصل زندگی کا فریم ہے، جو نا مساعد حالات کے سبب ٹوٹ کر کرچیوں کی صورت میں بکھر جاتا ہے۔

فسادات میں ہندو نے مسلمان کو مارا اور مسلمان نے ہندو کو مارا۔سوچئے تو دونوں مذہب کے دشمن ہیں، انسانیت کے دشمن ہیں (انسانیت کے دشمن)۔

زبان، بیان پر خورشید حیات کی گرفت مضبوط

ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ افسانوں میں قصّے کے عنصر ' کی جانب کچھ اور توجہ دیں گے ؟

غالب نے کہا تھا ۔

دام ہر موج میں ہے ' حلقہ ہائے صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم ان کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں ۔

کلام حیدری

GOLD RUSH کے تحت دوڑتا بھاگتا فرد ایک بھیڑ چال کی نمائندگی کرتا ہے سادگی ' معصومیت اور قناعت سے قطع تعلق جس تعلق کو جنم دیتا ہے وہ FATAL ہے ۔

نیچر سے انحراف کی سزا نیچر ہی تجویز کرتا ہے ۔ حرص ' بربادی کی سو صورتیں رکھتی ہیں ۔ افسانہ " ایڈز " جدید مغربی تہذیب پھر بھی طنز ہے اور ایشیائی غریب ملکوں کی بے چارگی پر بھی

(حالی ' نئی کہانی نیا مزاج)

شوکت حیات

۱۹۷۰ء کے افسانے کی زندہ حسّیات کو ' جن چند افسانہ نگاروں نے تخلیقی صعوبتیں جھیلتے ہوئے ' نویں دہائی میں آگے بڑھایا اور تجربات کی نئی منزلوں سے ہمکنار کیا ' ان میں خورشید حیات کا نام خصوصی

اہمیت کا حامل ہے ۔ انھوں نے افسانے میں کثیر الجہت معنویت بحال کرتے ہوئے ستّری افسانے کی نئی علامتیت اور معنی آفرینی کی روایت کو تسلسل اور ارتقاء سے ہم آمیز کیا ہے ۔

تجرید کو تجسیمیت اور راست بیانیہ کو تہہ داری سے منّور کرتے ہوئے " ایڈز"، "طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد" ' "لفظوں کی موت" ' " بابا" جیسے اہم افسانے انھوں نے تخلیق کئے ' جو زندگی کو فطرت کا عطیہ سمجھتے ہوئے ۔ آج کے فرد کو فطرت کی قربتوں کے حصول کا فہم عطا کرتے ہیں اور CONSUMERISM کی بھیڑ چال چلتے ہوئے ' مادہ پرست سماج کو رُك کر از سر نو زندگی پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ' نئی معنویتوں کی دریافت کرتے ہیں ۔

یہی نہیں ' ۱۹۸۵ کا پانچ روزہ افسانہ ورکشاپ عالمی سطح پر اردو افسانے کی دنیا کا انوکھا واقعہ تھا ۔ جس کی کار گزاریوں پر مشتعمل گوپی چند نارنگ کی ضخیم کتاب " نیا ادو افسانہ ' انتخاب ' تجزیے اور مباحث " تاریخی اور دستاویزی حیثیت اختیار کر چکی ہے ۔ اس ورکشاپ میں ۱۹۷۰ کے افسانہ نگار پیش پیش تھے ۔ خورشید حیات نے اس ہنگامہ خیز ورکشاپ کے بعض اہم شرکاء کا انٹرویو لیا اور پورے ورکشاپ کا جائزہ لیتے ہوئے " آہنگ " کے خصوصی شمارہ کے ورکشاپ نمبر کے توسط سے اسے ایک نیا ویژن عطا کیا ۔ افسانوں کی تخلیقی تنقید کے سلسلے میں بھی سنجیدگی سے انھوں نے کئی قابل ذکر کام کئے ہیں ۔

ریلوے کی مصروف زندگی کی وجہ سے ان کے افسانوی سفر میں کئی سالوں کا وقفہ آیا ۔ مگر وقفہ جنوین تخلیقی فنکار کی زندگی کا نا گزیر عمل ہوا کرتا ہے لگا تار بلا روک ٹوک ' تھوک کے بھاؤ جو قلم کاری کی جاتی ہے ' وہ کمرشیل ' غیر ادبی اور صحافتی لفّاظی کے مترادف ہے ۔ جو بعض مدیروں کی مہربانی سے فکشن کا التباس پیدا کرتی ہے ۔

امید ہے اس افسانوی مجموعہ " ایڈز " کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا جائے گا ۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نئے احساسات اور آج کے مسائل کو عصری حالات میں پیش کرنے والی کہانی "ایڈز" آج کے قاری کو متاثر کرسکتی ہے ۔ اس کہانی میں جدید زندگی کی برق رفتاری کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ کی سنجیدگی بلکہ دل ہلا دینے والی ہیبت ناکی بھی ہے۔ اور جدید ترین خطرات اور اندیشے بھی ہیں ۔ انسانی معاشرہ آج مشینوں میں گھرا ہوا ہے ۔ لیکن جگہ جگہ سے اس کی خواہشات اور تمنّائیں سر اٹھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ اس ٹکراؤ سے گزرنے والا ان کا حسّاس انسان داخلی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ افسانہ کا کردار جو مسائل اور جذبے کی کشا کش سے دو چار ہے کوئی اور نہیں لگتا بلکہ وہاں خود فنکار کی شخصیت نظر آتی ہے ۔ اپنے وضع کردہ کردار سے فنکار کا یہ اپنا پن فن پارے کو خاصا

وقیع بنا دیتا ہے۔ اب جو کچھ کردار محسوس کرتا ہے یا جو مشاہدہ کرتا ہے وہ وہی ہے جو فنکار کا مشاہدہ و تجربہ ہے۔

"آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں ' بھاگ دوڑ چمک دمک مشینی زندگی اور ان سب کے بیچ لوگوں کی مصنوعی ہنسی۔

جہا ز سے اترتے ہی مجھے لگا کہ میں نے باہر کا کچھ پایا ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اندر کا کچھ ایسا اپنا پن کھو دیا ہے۔ جو زندہ رہنے کی پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔"

آج کا انسان اندر سے کتنا کھوکھلا۔ کتنا بے جان اور کتنا بکھرا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے بھی ہوتا ہے۔ اپنے وجود کے بکھرے ہوئے چھوٹے ٹکڑے کو اکٹھا کر کے نئے حالات میں اپنی ضرورتوں ' تمناؤں اور خواہشوں کے ساتھ با وقار شخصیت حاصل کرنے کے لئے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ یہ المیہ کی لمبی کہانی ہے۔

کہانی " ایڈز"نہ صرف مادی اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ ذہنی کشا کش اور نفسیاتی منظر نامے کو جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس سے دوسرے ممکنہ اسباب کی طرف بھی اشارہ بنتا ہے۔ غرض یہ کہ نئے حالات میں انسان آلات و جذبات کا حاکم نہیں بلکہ ان کا محکوم ہو کر رہ گیا ہے نئے احساسات کی ترجمانی کرنے والی کہانی " ایڈز" بہت دنوں تک یاد رہنے والی تخلیق ہے۔[حالی ' نئی کہانی نیامزاج]

ڈاکٹر حسین آرزو

اردو ادب کے مختصر دور کے مختصر لمحوں میں مختصر افسانوں نے ترقی کی جتنی منزلیں طے کیں۔ شاید ادب کی دوسری صنف نے نہیں کی۔ ہر چند کے صنف شاعری صنف افسانہ سے صدیوں پہلے عالم وجود میں آچکی تھی۔ پھر بھی افسانہ نے اتنی سُرعت کے ساتھ لوگوں کے-ذہن پر اپنی مقبولیت کا اثر چھوڑ نا شروع کیا کہ شاعری کی مقبولیت پر آنچ آنے لگی۔

در اصل یہ سب اس لئے ہوا کہ شاعروں کی سیتا لکچھمن ریکھا سے باہر قدم نکالنا نہیں چاہتی تھی۔ جب کہ افسانہ نگاروں کی سیتا نے لکچھمن ریکھا سے باہر قدم نکالا افسانہ نگاروں نے یہ ثا بت کر دیا کہ بغاوت میں مقبولیت اور ترقّی کے عناصر چھپے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ادب میں روایت سے بغاوت ہو یا تاریخ میں لکچھمن کی نصیحت سے' اس لئے جہاں شاعر پرانی روایتوں اور محسن شاعروں کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ وہیں افسانہ نگار ہر دور میں روایت سے بغاوت کر کے نیا تجربہ کرتا رہا وہ نیاز فتح پوری ' اور پریم چندر سے بغاوت کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور اپنے مشاہدات و نظریات سے اپنا نام ادب میں محفوظ کرا لیتا ہے۔ یہاں وہ اکیلے نہیں ہوتا۔ بلکہ احمد ندیم قاسمی ' اختر اورینوی ' خواجہ احمد عباس ' سعادت حسن منٹو جیسا حقیقت نگار اس سماجی شعور کا پروردہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد وقت کی مسند پر بیٹھا افسانہ نگار

کروٹ بدلتا ہے' اور تحلیل نفسی اور نفسیاتی موشگافیوں کو عصمت چغتائی اور سید محمد محسن کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔

یہاں مجھے افسانہ یا افسانہ نگاروں کی تاریخ بتانا مقصود نہیں۔ بلکہ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں شاعروں نے نئے تجربوں سے انحراف کیا ہے۔ وہیں افسانہ نگاروں نے نئے تجربے کئے جس کے نتیجہ میں یہ ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ آج بے جھجھک اردو مختصر افسانوں کو دوسری زبان و ادب کے مختصر افسانوں کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

ایسے ہی جدید افسانہ نگار وں کی فہرست میں ایک نام ہے خورشید حیات۔ در اصل خورشید حیات نے بہت ہی کم عرصے میں ترقّی کی منزلیں طے کر لیں۔ وہ جز میں کل اور قطرہ میں دجلہ دیکھنے والی بصیرتوں کے ما لک ہو گئے ہیں۔ وہ روایت سے بغاوت کر کے جدّت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رومان کے گہرے کہرے میں گم ہونا نہیں چاہتے بلکہ" چلتي رکتي گاڑی کے بیچ "بیٹھے ایک نئے سفر کی تلاش میں نکل جاتے ہیں. ان کا یہ افسانہ قاری کے ذہن میں ڈھلنا بھی جانتا ہے اور مچلنا بھی۔ وہ اپنے تا ثرات کا اظہار جس طرح اور جن الفاظ میں کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں مختصر افسانہ نگار قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہے اور جز میں کل یہ لڑکوں کا کھیل نہیں۔ یہاں بھی دیدہ بینا کی ضرورت ہوتی ہے وہ خورشید حیات کے قبضے میں ہوتا ہے۔روسو اپنی کتاب میں جن باتوں کو عوام تک پہنچانے کے لئے متعدد

صفحات کا سہارا لیتا ہے وہیں پر خورشید حیات صرف چند جملوں کے ذریعے مختصر افسانوں کے توسّط سے لوگوں تک اسی بات کو اس طرح پہنچا تا ہے کہ اس کی تحریر میں لرزش تک نہیں آتی' جہاں جوشؔ اپنی حسین دوشیزہ کو کنکر توڑ تے نہیں دیکھ سکتے اور انقلاب لانا چاہتے ہیں وہیں پر خورشید حیات بھی ہٹے کٹے انسان کو بھیک مانگتے ' نہیں دیکھ سکتے۔

"ایک پیسہ دے دو کی آواز مجھے اپنی طرف متوّجہ کر لیتی ہے' اور میں دیکھتا ہوں ایک ہٹّا کٹّا انسان بھیک مانگ رہا ہے تندرست بھی ہے اور توانا بھی۔ پتہ نہیں کون سی شکست سے آشنا ہے۔ پڑا لکھا دکھائی دیتا ہے۔ شگفتگی کا احساس چہرے پر نمایاں ہے شکست و ریخت تو مقدّر ہے لیکن فرار؟ نہیں حالات کا مقابلہ کرنا چاہئیے۔سعی پیہم

(چلتی رکتی گاڑی کے بیچ)

مندرجہ بالا تحریر یہ بتاتی ہے کہ موجودہ تہذیب سے وہ خوش نہیں ہیں۔ وہ اس سے فرار کا راستہ بھی نہیں پوچھتے بلکہ وہ اس تہذیب کے چراغوں کو بجھا کر ایک نئی تہذیب ایک نئے معاشرے کے چراغوں کو جلانا چاہتے ہیں' ان کی نگاہیں دوسری تہذیب کو کھوج رہی ہیں۔ یہ تہذیب Das Capital میں بھی بند ہو سکتی ہے اور' اور میں بھی وہ بتاتے ہیں کہ مقدّر سے ٹکراؤ اس سے فرار کا راستہ مت مانگو ان کے خیال میں حالات کا مقابلہ کرنا چاہئیے۔ خواہ اس کے لئے کوئی بھی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ اقبالؔ۔ جوشؔ اور

سردار جعفریؔ جہاں نظموں اور غزلوں کے ذریعہ اپنا
پیغام ابن آدم تک پہنچانے کا راستہ ڈھو نڈتے ہیں'
وہیں ان کے قدم بڑی تیزی سے ترقی پسندی کی طرف
بڑھتے ہیں۔
"قدریں شکست کھا چکی ہیں نئی قدروں کی تشکیل ہورہی ہے اب کوئی
اپاہج بھیک نہیں مانگے گا اب تو ہٹے کٹے بھیک مانگیں گے۔ نئی قدروں کا یہ بڑا
تحفہ ہے"

(چلتي رکتي گاڑی کے بیچ)

میرے خیال میں افسانہ لکھنا جتنا آسان کام ہے
اچھے افسانے لکھنا اتنا ہی دشوارکام ہے 'مگراس کام
کو خورشید حیات زندگی کے بنیادی اسرار کی علامتوں
کا سہارا لے کر جس چابکدستی سے بیان کر جاتے ہیں
وہ ان ہی کے درجے کے افسانہ نگار سے ہو سکتا ہے۔
واقعی خورشید حیات کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ
وہ اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کے ہاتھوں میں دشنہ
و خنجر دے دیتے ہیں۔ ان کی نگاہیں جب یہ دیکھتی
ہیں کہ آج ان کے ملک کی اقتصادی حالت اسی طرح
پستی کی طرف مائل ہے۔ جس طرح وہ ۱۷۷۹ء کے پہلے
لوئی کے ملک میں ہوئی تھی تو وہ "وقت کے احاطے"
میں بیٹھ جاتے ہیں۔ خورشید حیات کی تحریر دلوں کو
دہلا دینا چاہتی ہے۔ وہ جدید یت کے اس طریقہ کار کو
گلے لگانا نہیں چاہتے۔ جس میں ان کو یہ خدشہ ہوتا
ہے کہ وہ ان کے ملک کے وجود کے لئے مضر ثابت ہوں
گے۔ وہ شراب کی بوتل پر روح افزا کا لیبل چسپاں کرنا
نہیں چاہتے۔ وہ شیشوں کی عدالت میں پتھر کی

گواہی کا نظارہ دیکھنا نہیں چاہتے ۔ ان کی نگاہیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ ہندو مسلم تہذیب کا شیرازہ لٹیروں کے قبضہ میں جا چکا ہے تو وہ اپنے قلم کی طاقت سے تلوار کا کام لے کر اس شیرازہ کو دو بار ہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں ۔

''شانتی نگر کے فساد نے اشانتی نگر کے فساد کا جواب دیا اور پھر سال کے اختتام پر دنیاوالوں نے جواہر لال اسٹیڈیم میں کھیل کود کر جشن منایا۔ بھوکے ننگے ملک کو دلہن بنا کر پیش کیا گیا کیونکہ ازل سے تصنع ہماری قسمت ہے اور فی زمانہ تصنع کے مظاہرے کے بغیر کام ہی نہیں چلتا بھیک مانگنے سے ایڈ لینے تک کا مسئلہ بھیس پر ہی منحصر ہے۔ بھیس بدل بدل کر بھیک مانگو تاکہ کوئی جانے بھی نہیں کہ تم فقیر ہو۔

امارت کی شان بھی قائم رہے اور فاقہ کا مسئلہ بھی حل ہو تا رہے ہم جدید ہیں ' قدیم لوگ جو بھول کر چکے ہیں وہ ہم یقیناً نہیں کریں گے '' (وقت کے احاطے میں)

فن کار جب اپنے فن کی تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے تو اس کے سامنے ماضی کے وہ سب اصنام موجود ہوتے ہیں جنہیں ان کے پرکھوں نے تہذیب کی نمائندگی کے لئے رکھ چھوڑا تھا ۔ ان اصنام میں بعض اچھے ہوتے ہیں اور بعض خراب ۔ ایسے اصنام جن میں کچھ نقص رہ جاتا ہے ۔ انہیں جدید دور کا فن کار پُر کر نے کی کوشش کرتا ہے ' ایسی ہی ایک کوشش خورشید حیات بھی کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں مارکسی تعلیم کی جھلک بھی ملتی ہے ۔

''تم چاہتے ہو بھائی کے میرا میں تمہارے میں کی نمائندگی کرے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جہاں سے کسی کا میں جاگتا ہے وہیں سے محکومی ختم ہو جاتی

ہے۔میں کی بیداری نوٹوں کی گڈی سے نہیں سلائی جا سکے گی" (لفظوں کی موت)

میں کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی اہمیت سے۔ کیونکہ 'میں' ایٹم بم سے بھی زیادہ بھیانک اور خوفناک چیز ہے۔ واقعی ہے اور سو فیصدی ہے اس لئے میں کی بیداری پوری قوم کی بیداری ہوتی ہے جو ان سارے کاموں کو کرجاتی ہے جنہیں ایک کیا سو ایٹم بم بھی نہیں کر سکتے۔ کارل مارکس نے اسی 'میں' کو سمجھا اور اپنی کامیابی کا راز بنایا۔ اقبالؔ نے جانا اور اپنی خودی کے تخم کے طور پر استعمال کیا۔ یورپین سیاستداں میزنی اور گیرا بالڈی نے بھی 'میں' کی اہمیت سے لوگوں کو روشناس کرایا اور اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کیا گویا یہ 'میں' نہیں دنیاوی آب حیات ہے جو خورشید حیات کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

فن کار کے فن کو پرکھنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنے فن کی نمائش کس طرح اور کس پیمانے پر کی ہے۔ خواہ وہ مصوری کی دنیا ہو یا افسانوں کے طلسم۔ اچھے اور کامیاب افسانہ نگار کے لئے سب سے ضروری یہ بات ہوتی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان کے ذہن میں خیالات ' نظریات اور مشاہدات کی دنیا بسی ہوتی ہے۔ اس کو وہ کن تصویروں میں پیش کرتا ہے۔ اور اس کے پیش کرنے کا انداز کیا ہوتا ہے۔ کامیابی کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ علامتی یا تجریدی یا جنسی افسانے لکھے بلکہ وہ جو

کچھ لکھے اس میں نیا رنگ بھر کر انفرادیت کا جامہ پہنائے' تب ہی اس کی تخلیق انفرادیت کی منزل تک پہنچ سکتی ہے

خورشید حیات نے علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں ۔تجریدی بھی اور اور بھی ۔ وہ علامتوں کا سہارا لے کر ایک نئی دنیا کو تلاش کرتے ہیں ۔ اور اس فن چابکدستی سے تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں کہ ان کے طرز ادا میں کہیں بھی جھول نہیں معلوم ہوتا ہے ۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کامیاب کہانی کار کو اس کے نظریات اور مشاہدات میں بیکراں وسعت کے ساتھ اس کے اسلوب بیان میں ایک نیا انداز بھی چاہئے ۔ ان کا انداز بیان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ افسانوں کے لئے نیک فال ہیں

[معلّم اردو' گوشۂ خورشید حیات' اکتوبر ۱۹۸۲ء]

S. A. FARAH

Retd ,Suptd. ,C.. I.. D, Patna, Bihar

Mr.khursheed Hayat ,a chief controller in the S.E.Rly, needs no introduction .This young man, coming from a family Literatures, has made a name for himself in the literary circles of the country . Even , as a student, he had all the makings of a good and blooming urdu writer. He has been a. regular contributer to most of the famous urdu journals published in the country even though occupying a responsable position in the railway. He continue to be a regular contributor to various Urdu magazines.

Lately , his merit has also been recognized by the Bihar urdu Academy and given a grant in the

publication of his latest book . As a railway chief controller, his merit was also recongnized by th top brass of railway, winning the COM AWARD for his excellent performance. In the high and dry railway service , all praise goes to him in running after his literary persuits.

Keep it on, Mr khursheed, you are Still miles to go to prove your.

حروف جو لفظ بن گئے

نغمہ حیات

زندگی بہت سارے اتار چڑھاؤ سے گزرنے کے بعد آج اس مقام پر آ پہنچی ہے کہ مجھے خورشید کے بارے میں کچھ لکھنے کا موقع ملا ہے۔

میری نظر میں یہ افسانوں کی دنیا' اس بڑی کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا حصّہ ہے۔بھلے ہی اسے لوگ جانتے ہوں' لیکن وہ صرف اپنے قلم / کاپی / کتابوں / دوستوں تک ہی' محدود ہوتی ہے۔ چند ہی خوش نصیب بیوی بچّے ہوتے ہوں گے جو اس کی اس دنیا میں شامل ہوتے ہوں گے۔

مجھے عجوبے / نئی کھوج زیادہ متاثر کرتے ہیں۔شادی کے بعد ان کے قلم کی نب کو توڑنے میں میرا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے جس سے خورشید کہانیاں لکھا کرتے تھے۔اسے قبول کرنے میں مجھے کوئی شرم نہیں۔ چونکہ میں شروع سے بہت زیادہ Devoted

بیوی رہی ہوں اور میری اس خوبی سے خورشید کے
اندر کا کہانی کار بھی دب گیااور پھر انہیں زندگی
میں کوئی کمی بھی دکھائی نہیں دینے لگی.جب
انسان مطمئن ہوجاتاہے تو اس کے دماغ کی نسیں
بھی کمزور پڑجاتی ہیں.زندگی جو ایک سڑك ہے
ہمیشه اُتار چڑھاوَ سے بھرپور ہے ۔ کبھی سورج کے
بدن کا جلنا ،گرم ہواؤں کا بہنا، موسموں کا بدلتے
رہنا۔ ہماری زندگی میں بھی یه موسم ہمیشه نه رہا۔
حال ہی میں زندگی نے یوں کروٹ بدلی که ساری
خوش فہمیاں دور ہوگئیں ۔ پہلے جو دنیا رنگین اور
بہاروں سے بھری نظر آتی تھی' اچانک اگ آئے
کانٹوں ، ناانصافیوں، ناہمواریوں کی گرمی نے
ہمارے دماغ کے جمے لہومیں اُبال پیداکردیئے ۔ تیزی
سے جسم میں بہتے لہو میں' خیالات بھی تیزی کے
ساتھ دوڑنے لگے اور اچانک دس سال بعد' جیسے
بچوں کی کہانیوں میں راج کماری کے سر اور پیر کے
نیچے پڑی ''چھڑی'' کو ادل بدل کردینے سے سوئی
راج کماری جاگ جاتی تھی اسی طرح خورشید کی
بیہوشی بھی ختم ہوگئی۔

شادی کے بعد ان کی مطبوعه اور غیر مطبوعه
کہانیوں کو ایک بوری میں بند کرکے اپنے سرونٹ
کوارٹر میں رہ رہی بڑھیا کی ''کوٹھری'' میں بند
کردیاتھا۔

دس سال بعد اسی بوری کو میں نے کھولا ۔ کئی

لفظ اپنی پہچان کھوچکے تھے یا مٹ گئے تھے ان سبھوں کو میں نے اپنی محبت اور محنت سے زندہ کیا اور پھر لفظ بولنے لگے۔

آج سے دس سال پہلے خورشید کو اس خیالی دنیا سے چرالے جانے کی خطابھی میری تھی اور آج ان کی واپسی میں کچھ حد تک میری بھی حصہ داری رہی ہے۔ یہ لکھنے میں مجھے کوئی فخر محسوس نہیں ہورہاہے کیونکہ خورشید کی خطرناك بیماری کے بعد جس نے مجھے اس حد تک توڑ دیاتھا کہ مجھے خود کو سمیٹ پانا مشکل لگ رہا تھا۔ایسے وقت میں میں خورشید کا حوصلہ کیا بڑھاپاتی۔ اسی دوران زندگی کے کچھ اتنے کڑوے تجربے ہوئے جس نے ادب کے راستے کھول دیئے اور اس کائنات کے خالق نے 'جس کی تعریف 'کیا کسی کا قلم کرسکے گا' خورشید کی صحت کو واپس لوٹا دیا۔

میں نے محسوس کیاکہ ادب نے' خورشید کی زندگی میں' ان کے درد دل میں دوا کا کام کیاہے۔ ایک اور شخص ہے جس سے میں متاثر ہوں وہ ہیں بھائی افتخار امام صدیقی کہ جن کی شاعری لاجواب تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھے انسان ہیں / نئی اردو شاعری کے امام ہیں۔ میری نظر میں اچھا انسان ہے وہ 'جو اپنے گھر کے لوگوں میں اچھا ہو' وہ جو اپنی بوڑھی ماں کا اچھا بیٹا ہو' بغیر باپ کی بھتیجیوں کا لاجواب چچا ہو اور خورشید جیسے

زمانے کی چوٹ کھائے انسانوں کے لئے رہبر ثابت ہواہو۔ ”خالق“ جب ایک دروزہ بند کرتاہے کئی دروازے کھول دیتاہے۔ ہمیں ستمگروں سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو سوئی راج کماری کی چھڑی ادل بدل کون کرتا۔

ایک دن میں نے دیکھا خواب میں، آسمان کو لہراتے نیلے دوپٹے کی طرح ، چاند کو چمکتے ہیرے کی طرح، سورج کو دمکتے سونے کی طرح ، زمین کو سات رنگیں قالین کی طرح، انسان کو ہنستے' زندگی کی طرح ، بتاؤ یہ نشانی کس کی ہے۔

مجھے خورشید کی کہانیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے ۔بہتر ہے قارئین فیصلہ کریں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ خورشید کے پاس لفظوں کا ایک مضبوط جال ہے جو پڑھنے والوں کو لفظوں کی گہرائی میں اترنے کے لئے مجبور کرتاہے۔

میری نظر میں کوئی بھی تحریر مکمل نہیں اس خدا کی تحریر کو چھوڑ کر۔

ابتدا سے اب تک کے سلسلے بتاتے ہیں
یہ جہاں مکمل ہے ' آدمی ادھورا ہے

(افتخار امام صدیقی)

خورشید ایک اچھے باپ ہیں، شوہر ہیں وہ ایک اچھے کہانی کار ہیں کہ نہیں یہ فیصلہ آپ پر۔

آخر میں بہار اردو اکادمی کے ُہم' شُکر گزار ہیں کہ جس کی مالی اعانت سے ”ایڈز“ کی اشاعت ممکن ہوسکی۔

(SHORT STORIES)

BY

KHURSHEED HAYAT

تم چاہتے ہو بھائی کہ میرا "میں" تمہارے "میں" کی نمائندگی کرے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں سے کسی کا "میں" جاگتا ہے۔ وہیں سے محکومی ختم ہو جاتی ہے۔ "میں" کی بیداری نوٹوں کی گڈی سے نہیں سلائی جا سکے گی۔

(لفظوں کی موت)

"دروازہ بند نہیں ہوتا میرے عزیز! دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا ایک دروازہ کو بند کرنے سے کئی دروازے کھل جائیں گے اور ہر دروازہ تمہیں نئی آواز دے گا۔"

(طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد)